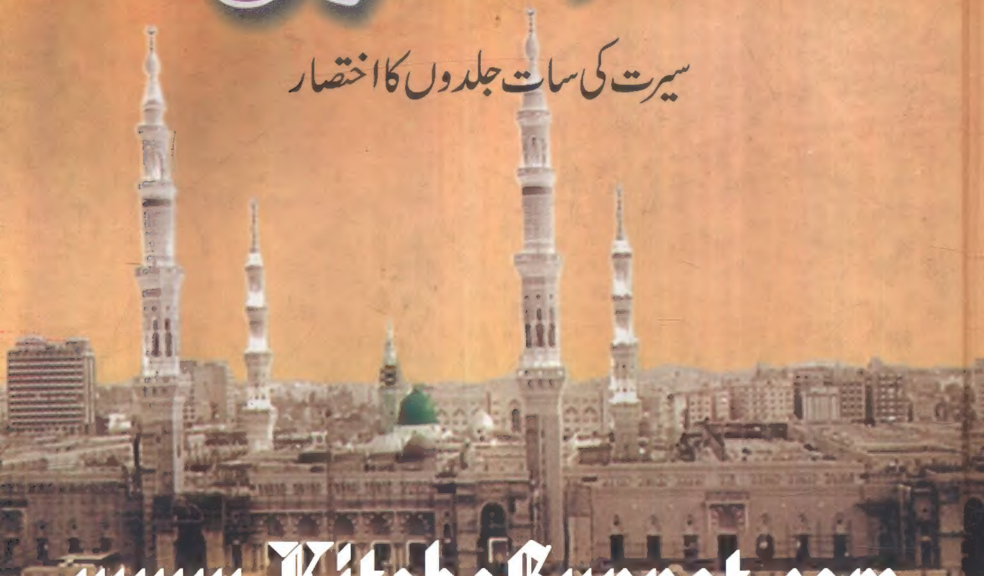
سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سیرت کی سات جلدوں کا اختصار



مصنفہ : علامہ شبلی نعمانیؒ ، سید سلیمان ندویؒ

مرتبہ : پروفیسر مولانا محمد رفیق چودھری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

مختصر

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مصنفہ

علامہ شبلی نعمانیؒ

سید سلیمان ندویؒ

مرتبہ

پروفیسر مولانا محمد رفیق

مکتبہ قرآنیات، لاہور

نام کتاب : سیرت النبیؐ (اختصار)

تالیف : سیّد سلیمان ندویؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ

مرتبہ : پروفیسر مولانا محمد رفیق

ناشر : مکتبہ قرآنیات، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ،
اُردو بازار لاہور۔ پاکستان
فون: 5811297، موبائل: 0333-4399812
0321-7724032

اہتمام : حافظ تقی الدین

سن اشاعت : 2008ء

قیمت : -/300 روپے

ملنے کے پتے

مکتبہ قرآنیات، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور
1۔ کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور
2۔ کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار، راولپنڈی

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا شہنشاہِ کونین ﷺ کے دربار میں

اخلاص وعقیدت کی نذر لے کر آیا ہے۔ ع

زِ چشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

"شبلی"

شوال ۱۳۳۰ھ

☆☆☆☆☆

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆

سیرت النبیؐ، جلد دوم (2) 131

☆☆☆☆☆

سیرت النبیؐ جلد سوم (3)

دلائل و معجزات

☆☆☆☆☆

سیرت النبیؐ جلد چہارم (4) 215

☆☆☆☆☆

سیرت النبیؐ، جلد پنجم (5)

☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

''سیرت النبیؐ'' (از علامہ شبلی نعمانیؒ و سید سلیمان ندویؒ) کو اُردو زبان و ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ اس لیے اب یہ کتاب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سیرت کے اس نقش اول کے بعد کا ہر نقش دیگر بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی سے مستفاد ہے۔ اردو کا کوئی سیرت نگار اس عظیم کتاب کے مطالعے اور استفادے سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

جیسا کہ معلوم ہے یہ کتاب محض سیرت کے موضوع پر نہیں لکھی گئی بلکہ اس میں سیرت نبویؐ کے ساتھ ساتھ سیرت کا پیغام یعنی دین اسلام کی عام تعلیمات بھی شامل ہیں۔ اس طرح یہ کتاب سیرت اور اسلامی تعلیمات کا اچھا خاصا انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں شبلی نعمانیؒ نے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمان شروانیؒ کو اس بارے میں لکھا تھا کہ:

> ''چاہتا ہوں کہ ہر قسم کی مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا، گو لمبا ہے ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔''
>
> (مکتوبات شبلی، صفحہ 104)

حقیقت یہ ہے کہ سیرت پر ایسی جامع کتاب لکھنا شبلی مرحوم کا ایک اچھوتا خیال تھا۔ اسی بات کو شبلی نعمانیؒ کے لائق شاگرد اور ان کے نامکمل کام کی تکمیل کرنے والے

مورخِ اسلام سید سلیمان ندوی اسی کتاب کی جلد پنجم کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیرَ کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے۔ اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔''

''سیرت النبیؐ'' کا یہ سلسلہ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔
پہلی دو جلدوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت پیش کی گئی ہے۔
تیسری جلد کا موضوع منصب نبوت اور معجزات ہے۔
چوتھی جلد عقائد و ایمانیات سے متعلق ہے۔
پانچویں جلد عبادات پر مشتمل ہے۔
چھٹی جلد اخلاقیات کے بارے میں ہے۔
ساتویں جلد معاملات اور سیاسیات پر ہے۔

شبلی نعمانیؒ ابھی دو جلدیں تحریر کر پائے تھے کہ نومبر 1914ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے انہوں نے اپنے شاگردِ رشید سید سلیمان ندوی کو وصیت کی تھی کہ وہ اس کام کی تکمیل کریں۔ چنانچہ باقی پانچ جلدیں (سوم تا ہفتم) سید سلیمان ندویؒ نے مکمل کی تھیں۔ اس کا کام کا آغاز 1330ھ میں ہوا۔ سیرت النبیؐ کی پہلی جلد مصنف کی وفات کے چار سال بعد 1918ء کو طبع ہوئی تھی اور آخری جلد سید سلیمان ندوی کی وفات 1955ء کے بعد شائع ہوئی۔ اس عظیم الشان کام کی تالیف اور تکمیل و طباعت کا قصہ بھی نصف صدی کا قصہ ہے۔ ع

یہ قصہ نصف صدی کا ہے، دو چار برس کی بات نہیں۔

اس بے مثل کارنامے میں شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کے علاوہ جن اور

اصحابِ علم و دانش نے مشاورت اور علمی و قلمی معاونت فرمائی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

1۔ پروفیسر عبدالباری ندوی جنہوں نے جلد سوم میں قلمی تعاون کیا۔
(پروفیسر فلسفہ جدیدہ، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن)

2۔ مولانا حمید الدین جنہوں نے کئی مفید مشورے دیے۔

3۔ مولانا عبدالسلام ندوی (رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ) انہوں نے جلد ششم میں قلمی معاونت کی۔

4۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ساتویں جلد کو جو سید سلیمان ندوی کی لکھی ہوئی تھی، مرتب کر کے شائع کیا۔

5۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جنہوں نے آخری جلد ہفتم کا دیباچہ لکھا۔

6۔ مولانا محمد اویس ندوی

اس کتاب کی مقبولیت

''سیرت النبیؐ'' کو بڑی شہرت اور قبولِ عام حاصل ہوا۔ خود سید سلیمان ندوی نے اس کتاب کی جلد پنجم کے دیباچے میں حسن قبول کے عنوان سے لکھا ہے کہ:

''اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی، چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعوؤں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمداللہ پیدا ہو گیا ہے اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف عام رجحان ہو گیا ہے۔''

پاک ہند میں اس کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ انگریزی سمیت کئی غیر ملکی زبانوں میں اس کے تراجم موجود ہیں۔ اس کتاب میں واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق پر بڑی محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے۔

شبلی کا اسلوب نگارش اپنے اندر گوناگوں خصوصیات رکھتا ہے۔ (جس کی پیروی سید سلیمان ندویؒ نے بڑی کامیابی سے کی ہے)۔ اس اسلوب (Style) کی پہلی خصوصیت اس کا ایجاز واختصار ہے۔ شبلیؒ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ دریا کو کوزے میں بند کرنا جانتے ہیں۔

داستانِ حسن جب پھیلی تو لا محدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام ہو کر رہ گئی

وہ بعض اوقات ایک جملے میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جس کے لیے پوری کتاب کے صفحات درکار ہوتے ہیں۔ ان کا قلم اعجاز رقم ہے۔ جو باغ و بہار طبیعت رکھتا ہے شبلیؒ بنیادی طور پر مورخ ہیں لیکن وہ خشک تاریخی واقعات کو اتنی شگفتگی اور ادبیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ قاری کو دلچسپ محسوس ہوتے ہیں۔ فن تاریخ میں ان کا اپنا قیاس و اجتہاد بھی حقیقت بلکہ الہام معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں اپنے تبحرِ علمی سے ایسے رموز و اسرار منکشف کرتے جاتے ہیں کہ قاری پر اُن کے علم کا سحر طاری ہو جاتا ہے۔ بعض ہندی دانشوروں اور ادیبوں نے شبلیؒ کو "علم کا دیوتا" کہا ہے۔

"سیرت النبیؐ" شبلیؒ کا شاہکار ہے جس کی تکمیل ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے کی ہے۔ یہ کتاب تحقیقی ہے اور بڑی افادیت کی حامل ہے۔ تاہم سات بڑی جلدوں میں ہے اور ایک عام آدمی کے لیے اس کا مطالعہ اس تیز رفتار اور معروفیت کے دور میں بہت مشکل ہے۔ اس لیے میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اس عظیم کتاب کا اختصار کیا جائے اور ایک ہی مختصر جلد میں اس کی تلخیص پیش کی جائے تاکہ کتاب کے زیادہ ضروری مواد (Matter) اور معلومات کو ایک عام قاری کم وقت میں حاصل کر سکے۔ حدیث کی سب سے مشہور کتاب صحیح بخاری تک کا مختصر ایڈیشن دستیاب ہے۔

علمی دنیا میں ضخیم کتب کے اختصارات کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لہٰذا میں نے "سیرت النبیؐ" کی سات جلدوں کے مضامین کا اختصار کرکے اسے ایک جلد میں "مختصر سیرت النبیؐ" بنا کر پیش کر دیا ہے جس کی تمام عبارت اور پورا متن (Text) اصل

مصنفین یعنی شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کا ہے۔ راقم نے صرف یہ کام کیا ہے کہ زیادہ اہم مضامین کا انتخاب کر کے اُن کو مناسب تصنیفی ترتیب دی ہے تاکہ قاری کو کتاب میں کہیں خلا محسوس نہ ہو اور کم سے کم وقت میں سیرت النبیؐ کے اہم مضامین پر اس کی نظر رہے۔ البتہ تفصیل کے طالب کو اصل کتاب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اب اس کام میں دو معمولی اور مناسب تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

1۔ قرآنی آیات کے حوالے جو پہلے رکوع کی شکل میں تھے اب سورہ اور آیات کے نمبروں کی صورت میں دے دیے گئے ہیں۔

2۔ تمام اردو ہندسوں کو انگریزی ہندسوں میں بدل دیا گیا ہے۔

بہر حال یہ ایک نازک اور ذمہ دارانہ کام تھا جو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس سے مقصود افادۂ عام ہے۔ اس میں جہاں کہیں مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے اس سے اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور میری اس حقیر خدمت کو شرف قبولیت بخشے، آمین!

لاہور　　　　　　　　　　والسلام

14۔ اگست 2003ء　　　　　　محمد رفیق چودھری

مطابق 15 جمادی الثانی 1424ھ

☆☆☆☆☆

سیرت النبی ﷺ

جلد اوّل (1)

عرب

وجہ تسمیہ

عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ عرب اور أعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو "عرب" اور دنیا کی تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں عربہ تھا۔ عربہ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت وصحرا ہے اس لیے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ

عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں:

مغرب: بحیرۂ قلزم

مشرق: خلیج فارس اور بحر عمان

جنوب: بحر ہند

شمال: کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں۔ بعض مملکت حلب اور فرات تک اُس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں۔

سینا کا جزیرہ نما، جس کا نام التیہ ہے، اکثر مصنفین عرب و یورپ اس کو مصر میں

شمار کرتے ہیں لیکن جیالوجی (Geology) کی رُو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب کی پیائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی، تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمنی اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے۔ طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ مربع میل ہے۔

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے۔ پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ سب سے بڑا طویل سلسلہ پہاڑ جبل السراۃ ہے جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ بلند ہے۔ بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

عرب کے اقوام وقبائل

مورخین عرب نے اقوام وقبائل عرب کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے:

(1) عرب بائدہ: یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے پہلے فنا ہو چکے تھے۔

(2) عرب عاربہ: بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصل مسکن ملک یمن تھا۔

(3) عرب مستعربہ: بنو اسماعیل یعنی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہور اسلام کے وقت بنو قحطان اور بنو اسماعیلؑ جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے۔ ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی۔ اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا۔ ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل وفروع سے تھا جو یمن سے شام تک ہر قطعۂ زمین میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کی پھر چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں۔

تہذیب وتمدن

تہذیب وتمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے۔ اسی طرح عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آلِ نعمان کا پایۂ تخت

تھا اور حوران جو خاندان غسان کا صدر مقام تھا، تہذیب و تمدن سے خالی نہ تھے۔

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی۔ عربی زبان نہایت وسیع ہے۔ باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے، اُن کے لیے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے۔ بلکہ ایران یا روم سے مُستعار آئے ہیں۔ سِکّہ کے لیے ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ درہم یونانی لفظ درخم ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا۔ چراغ معمولی چیز ہے۔ تاہم اس کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا۔ چراغ کو لے کر سراج کر لیا۔ پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا، مصباح یعنی ایک آلہ ہے جس سے صبح بنا لی جاتی ہے۔ کوزہ کے لیے کوئی لفظ نہیں۔ کوزہ کو کوز کر لیا ہے۔ پیالہ کو کَأْس کہتے ہیں، وہی کاسہ فارسی لفظ ہے۔ کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے۔ پاجامہ کو سِرْوَال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے لفظ نہ تھے، تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لیے کہاں سے لفظ آتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی، آس پاس کے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی۔ اس لیے جو مقامات اُن ممالک سے دُور تھے، اُسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے۔ مسئلہ حجاب کے شانِ نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور (Latrine) نہ تھی۔ مستورات رفعِ حاجت کے لیے باہر جایا کرتی تھیں۔ ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں۔ بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے جو رہ جاتا تھا وہی آٹا ہوتا تھا۔ بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے۔

☆☆☆☆☆

عرب میں مذاہب

عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے۔ یہودیت بھی، نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحاد بھی۔ لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا؟ عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کر سکی۔ اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔ یا توحید تھی لیکن خدا اس قسم کا تھا جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا۔ (1)

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی۔ باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی۔ حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی۔ ازدواج کی کوئی حد نہ تھی۔ قمار بازی، شراب خوری، زنا کاری کا رواج عام تھا۔ بے حیائی کی یہ حالت کہ سب سے بڑا نامور شاعر امراء القیس جو شہزادہ بھی تھا، قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔ عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا۔

یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی، اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتاب عالم تاب کی حاجت نہ تھی؟

---

(1) توریت، تکوین آیت 22 تا 29 میں حضرت یعقوبؑ کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب یہ ہے:

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

عدنان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں اور آنحضرت ﷺ عدنان کے خاندان سے ہیں۔

عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، کس کے نام پر نکلتا ہے۔ اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا۔ یہ اُن کو لے کر قربان گاہ کو چلے۔ عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربان کیجئے، ان کو چھوڑ دیجئے۔ عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو۔ اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب نے اب دس کی بجائے بیس اونٹ کر دیے۔ یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو (100) تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا۔ عبدالمطلب نے سو اونٹ قربان کیے اور عبداللہ بچ گئے۔ یہ واقدی کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر رؤسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو اُن کی شادی کی فکر ہوئی۔ قبیلہ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں

ممتاز تھیں۔ وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں۔ عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا۔ انہوں نے منظور کیا اور عقد ہو گیا۔

عبداللہ تجارت کے لیے شام کو گئے۔ واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہو کر یہیں رہ گئے۔ عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لیے بھیجا۔ وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔

عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی، جس کا نام اُمِّ ایمن تھا۔ یہ سب چیزیں رسول اللہ ﷺ کو ترکہ میں ملیں۔

☆☆☆☆☆

ظہورِ قدسی

چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آ چکی ہیں۔ چرخ نادرۂ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرکہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔

آج کی صبح توحید کا غلغلہ اُٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آ گئی۔ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اُٹھا۔

یعنی یتیم عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہِ کونین، عالمِ قدس سے عالمِ اِمکان میں تشریف فرمائے عزت واجلال ہوا۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلِّمْ.

تاریخ ولادت

تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں اُنہوں نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپؐ کی ولادت 9 ربیع الاوّل روز دوشنبہ (پیر) مطابق 20۔اپریل 571ء میں ہوئی تھی۔

آپؐ کا نام ''محمدؐ'' رکھا گیا اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثوبیہ نے دودھ پلایا (جو ابولہب کی لونڈی تھی)۔

حلیمہ سعدیہ

ثوبیہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفا، شیر خوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے۔ یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے، اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

غرض دستور مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں اور شرفائے شہر اپنے شیر خوار بچوں کو اُن کے حوالے کر دیا کرتے تھے، اس دستور کے موافق آنحضرت ﷺ کی ولادت کے چند روز بعد قبیلہ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں ان میں حضرت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں، اتفاق سے اُن کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔

آنحضرت ﷺ کی والدہ نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی۔ لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں۔ اس لیے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی، اور آنحضرت ﷺ کو لے کر گئیں ان کی ایک صاحبزادی تھیں، جن کا نام شیماء تھا۔ ان کو آنحضرت ﷺ سے بہت اُنس تھا وہی آپ کو کھلایا کرتی تھیں دو برس کے بعد حلیمہ آپ کو مکہ میں لائیں، اور آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا لیکن چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی۔ آپ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ، چنانچہ دوبارہ گھر میں لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپ حضرت حلیمہؓ کے یہاں کتنے برس تک رہے، ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ 6 برس لکھا ہے۔

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے۔ بنی سعد ہوازن ہی

کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، عہد نبوت میں جب وہ آپؐ کے پاس آئیں تو آپ ''میری ماں میری ماں'' کہہ کر لپٹ گئے۔ یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہ آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے وفات کر گئیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن ابی خیثمہ نے تاریخ میں، ابن جوزی نے حداء میں، منذری نے مختصر سنن ابی داؤد میں، ابن حجر نے اصابہ میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے، حافظ مغلطائی نے ان کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ''التحفۃ الجسیمہ فی اثبات اسلام حلیمہ'' ہے۔

حضرت حلیمہؓ کے شوہر یعنی آنحضرت ﷺ کے رضاعی باپ کا نام حارث ابن عبدالعزیٰ ہے۔ وہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام لائے۔

حارثؓ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا، حارث مسلمان ہو گئے۔

رضاعی بہن بھائی

آنحضرت ﷺ کے چار رضاعی بھائی بہن تھے جن کے نام یہ ہیں۔ عبداللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ جو شیماء کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبداللہ اور شیما کا اسلام لانا ثابت ہے، باقیوں کا حال معلوم نہیں۔

مدینہ کا سفر

آنحضرت ﷺ کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپ کی والدہ آپؐ کو لے کر مدینہ گئیں چونکہ آنحضرت ﷺ کے دادا کی ننہال خاندان نجار میں تھیں، وہیں ٹھہریں، اس سفر میں اُمِ ایمنؓ بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت ﷺ کی دایہ تھیں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ آپؐ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں، لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے، میرے نزدیک بعض مورخین کا

یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لیے گئی تھیں جو مدینہ میں دفن تھے۔ بہر حال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں، واپس ہوتے ہوئے جب مقام ابواء میں پہنچیں تو ان کا انتقال ہو گیا، اور یہیں مدفون ہوئیں، ام ایمنؓ آنحضرت ﷺ کو لے کر مکہ میں آئیں۔

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو اپنے دامن تربیت میں لیا، ہمیشہ آپؐ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت ﷺ بھی ساتھ تھے۔ اور فرط محبت سے روتے جاتے تھے، عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابو طالب کو آنحضرت ﷺ کی تربیت سپرد کی، اب طالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رعبۂ امتیاز کو دفعتہً گھٹا دیا، اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنو امیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آ گیا، عبدالمطلب کی مسندِ ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابو طالب کی کفالت

عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں سے آنحضرت ﷺ کے والد عبداللہ اور ابو طالب ماں جائے بھائی تھے، اس لیے عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کو ابو طالب ہی کے آغوش تربیت میں دیا، ابو طالب آنحضرت ﷺ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ سوتے تو آنحضرت ﷺ کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً جب آپ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں، فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے کہ ابو طالب چونکہ محمد ﷺ کو رذیل رکھتے تھے، اس لیے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفاء اور امراء کے بچے بکریاں چراتے تھے خود قرآن مجید میں ہے۔ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ۔ (النحل آیت 6) اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا۔

☆☆☆☆☆

شام کا سفر

ابو طالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابو طالب نے حسب دستور شام کا اردہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت ﷺ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ کو ابو طالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابو طالب چلنے لگے تو آپؐ ان سے لپٹ گئے، ابو طالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابو طالب بصرے میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے، جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت ﷺ کو دیکھ کر کہا، یہ سید المرسلین ہیں، لوگوں نے پوچھا تم نے کیونکر جانا، اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لیے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سرولیم میور، ڈریپر، مارگولیس وغیرہ سب اس واقعہ کہ عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق واسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے انہی پر آنحضرت ﷺ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی اور اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے۔ اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ قیاس میں بھی نہیں آ سکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام حقائق سکھا دیے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت نا قابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں، سب مرسل ہیں یعنی راویت اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا اور اس راویت کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

☆☆☆☆☆

حرب فجار کی شرکت

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک تھی۔

یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلہ میں ہوئی تھی، قریش کے تمام خاندان نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ ﷺ بھی شریک تھے بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہو گیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں برسر حق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا اس لیے رسول اللہ ﷺ نے بھی شرکت فرمائی لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

اس لڑائی کو فجار اس لیے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول

لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھرانے برباد کر دیے تھے اور قتل و سفا کی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی۔ جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ ﷺ کے چچا اور

خاندان کے سرگروہ تھے، یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندان ہاشم، زہرہ اور تیم، عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔

آنحضرت ﷺ اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا، اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔

اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لیے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا ان کے نام میں لفظ فضیلت کا مادہ داخل تھا یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن داعہ اور مفضل، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلہ کے تھے، اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا، چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی۔ تاہم بانیوں کو نیک نیتی کی یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے۔

☆☆☆☆☆

تعمیر کعبہ

کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی، اور دیواروں پر چھت نہ تھی، جس طرح ہمارے ملک میں عید گاہیں ہوتی ہیں۔ چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا، اس کی روک کے لیے بالائی حصہ پر بند بنوا دیا گیا تھا، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا، بالآخر یہ رائے قرار پائی۔ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے۔ حسن اتفاق یہ کہ جدہ کے بندر گاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا، قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لیے۔ جہاز میں ایک رومی معمار تھا جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لے آیا، اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی، مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لیے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے۔ لیکن جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا، تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا۔ اس موقع پر بھی بعض دعوے داروں نے یہ رسم ادا کی، چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے۔ سب نے یہ رائے تسلیم کی۔ دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمہ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں، وہ جمال

جہاں تاب چہرہ محمدیؐ تھا۔ لیکن رحمت عالم ﷺ نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہو آپؐ نے فرمایا جو قبائل دعوے دار ہیں سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک چادر بچھا کر حجر اسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر اٹھائیں، جب چادر موقع کے برابر آ گئی تو آپؐ نے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا، یہ گویا اشارہ تھا کہ دین الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی ان ہی ہاتھوں سے نصب ہو گا۔

اسی طرح ایک سخت لڑائی آپ کے حسن تدبیر سے رک گئی۔ کعبہ کی عمارت اب مسقف کر دی گئی، لیکن چونکہ سامان تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصہ کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہو گا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں، اور جس کی نسبت آنحضرت ﷺ نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنائی جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں دیوار کعبہ کے ڈھانے سے بدگمان ہو جائیں گے۔"

شغل تجارت

عرب اور خصوصاً قریش یعنی بنی اسمٰعیل ظہور اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ تھے۔ آنحضرت ﷺ کے جدا اعلیٰ "ہاشم" نے قبائل عرب سے تجارتی معاہدے کر کے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کر دیا تھا، آنحضرت ﷺ کے چچا ابو طالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سن رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو جب فکر معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

ابو طالب کے ساتھ آپؐ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا، اور آپ کے حسن معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخی کتابوں میں مذکور ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کس دیانت اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

تاجر کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ مثال ایفائے عہد اور اتمام وعدہ کی ہوسکتی ہے لیکن منصب نبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امینؐ اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا۔ تجارت کی غرض سے شام و بُصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپؐ نے کیے تھے۔

☆☆☆☆☆

تزویج خدیجہؓ

حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاتون تھیں، ان کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت ﷺ کے خاندان سے ملتا ہے، اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپ کی چچیری بہن تھیں، ان کی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھی، اب وہ بیوہ تھیں، چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، نہایت دولت مند تھیں۔ طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔

جناب رسول اللہ ﷺ کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی، متعدد قومی کاموں میں آپؐ شریک ہو چکے تھے، تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے، اس بنا پر آپ کے حسن معاملہ، راستبازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاقی کی عام شہرت ہو چکی تھی، یہاں تک کہ زبان خلق نے آپؐ کو امین کا لقب دے دیا تھا۔ حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ میرا مال تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپؐ کو اس سے زیادہ دوں گی، آنحضرت ﷺ نے قبول فرمایا اور مال تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام دیا، ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے، عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں، اور

اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی، حضرت خدیجہؓ نے چچا کے ہوتے خود براہِ راست تمام مراتب طے کیے۔ تاریخ معین پر ابو طالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے، ابو طالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچ سو طلائی درہم مہر قرار پایا۔

شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی۔

☆☆☆☆☆

آفتابِ رسالت کا طلوع

رسول اللہ ﷺ جس زمانہ میں پیدا ہوئے مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے، رسول اللہ ﷺ کے خاندان کا تمغائے امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے۔ بایں ہمہ آنحضرت ﷺ نے کبھی بتوں کے آگے سرنہیں جھکایا۔ دیگر رسوم جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی۔ قریش نے اس بناء پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہیے، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایام حج میں قریش کے لیے عرفات جانا ضروری نہیں اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں وہ قریش کا لباس اختیار کریں ورنہ ان کو عریاں ہو کر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا، چنانچہ اسی بناء پر طوافِ عریاں کا عام رواج ہو گیا تھا، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا جس کو حرا کہتے ہیں، آپؐ مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے وہ ختم ہو چکتا تو پھر گھر تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔ نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپؐ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے جو کچھ آپؐ خواب میں دیکھتے تھے بعینہٖ وہی پیش آتا تھا ایک دن جب کہ آپؐ حسب معمول غارِ حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتۂ غیب نظر آیا کہ آپؐ سے کہہ رہا ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ○ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ○ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ

یَعْلَمْO (العلق آیت 1 تا 5)

"پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا خدا کریم ہے وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپ گھر واپس تشریف لائے تو جلال الٰہی سے لبریز تھے۔

آپؐ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کیا وہ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عبرانی زبان جانتے تھے اور توریت اور انجیل کے ماہر تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا: یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کو ڈر پیدا ہوا۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپؐ متردد نہ ہوں۔ خدا آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ پھر وہ آپؐ کو ورقہ کے پاس لے گئیں۔ انہوں نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت ﷺ نے جب فرضِ نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں، اگر آپؐ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ و دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم انبیاء (ﷺ) کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لیے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لیے صرف وہ لوگ انتخاب کیے جا سکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے جن کو آپؐ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بناء پر آپؐ کے صدقِ دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپؐ کی حرم محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے جو آپؐ کی آغوشِ تربیت میں پلے تھے، زیدؓ تھے جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے، حضرت ابو بکرؓ تھے جو برسوں سے فیضیاب خدمت تھے، سب سے پہلے آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا، وہ سننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی

اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکرؓ دولت مند، ماہر انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا اور معززین شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے۔ ارباب روایت کا بیان ہے کہ کبار صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فاتح ایران، حضرت طلحہؓ سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے۔ ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان سابقین اولین میں عمارؓ، خبابؓ بن الارت، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ، ارقمؓ، سعیدؓ بن زید، عبداللہؓ بن مسعود، عثمانؓ بن مظعون، عبیدہؓ اور صہیبؓ رومی زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمانِ خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، نماز کا جب وقت آتا تو آنحضرت ﷺ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے۔

تین برس تک آنحضرت ﷺ نے نہایت راز داری کے ساتھ فرضِ تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتابِ رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر آیت 94)

اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔

اور نیز حکم آیا۔

وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ (الشعراء آیت 214)

اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔

آنحضرت ﷺ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر پکارا۔ يَا مَعْشَرَ الْقُرَيْش! لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ہاں! کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذابِ شدید

نازل ہو گا یہ سن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپؐ کا چچا بھی شامل تھا، سخت برہم ہو کر واپس چلے گئے۔ (صحیح بخاری جلد 2، ص 702)

چند روز کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو۔ یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندانِ عبدالمطلب مدعو کیا گیا، حمزہؓ، ابو طالب، عباسؓ سب شریک تھے۔ آنحضرت ﷺ نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے۔ اس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا۔"

تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعۃً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا، گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نو عمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

اب مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت تیار ہو گئی تھی، جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی، آپؐ نے حرمِ کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لیے دفعۃً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف سے لوگ آپؐ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت ﷺ کے ربیب حضرت حارثؓ بن ابی ہالہ گھر میں تھے ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت ﷺ کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں برس پڑیں اور وہ شہید ہو گئے، اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی۔

☆☆☆☆☆

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب

پہلا سبب

ناتربیت یافتہ اور تندخو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو اُن کے آبائی رسم و عقائد کے خلاف ہو ان کو سخت برہم کر دیتی ہے۔

عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ہبل خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر و شر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا یا تو سرے سے نہ تھا یا تھا تو وجودِ معطل تھا۔

دوسرا سبب

اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعۃً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت، اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لیے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

تیسرا سبب

قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ ابرہہ الاشرم (بادشاہِ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلوں میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو

قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا۔

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا، اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت ﷺ عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب

ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی، قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے بنو ہاشم و بنو امیہ، عبدالمطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحب اثر نہیں پیدا ہوا، ابو طالب دولت مند نہ تھے، عباس دولت مند تھے لیکن فیاض نہ تھے، ابولہب بدچلن تھا۔ اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کی نبوت کا خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا۔ اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت ﷺ کی مخالفت کی۔ بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

پانچواں سبب

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بد اخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بد اخلاقیوں کے مرتکب تھے، آنحضرت ﷺ ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان کرتے تھے دوسری طرف ان بد اخلاقیوں میں سخت دارو گیر کرتے تھے جس سے ان کی عظمت و اقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں اور گو طریقہ بیان عام ہوتا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

☆☆☆☆☆

قریش کے تحمل کے اسباب

ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلانِ دعوت کے ساتھ سخت خوں ریزیاں شروع ہو جاتیں لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا اور اس کے ناگزیر اسباب تھے، قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے اور حربِ فجار کے بعد اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے، قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لیے کھڑا ہو جاتا تھا اور جب تک بدلہ نہ لے لیا جائے یہ آگ نہیں بجھ سکتی تھی، رسول اللہ ﷺ کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لیے نہایت آسان تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں، اس لیے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا، رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں نیک نیتی کی بناء پر مخالفت کرتے تھے، اس بناء پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے۔

غرض جب آنحضرت ﷺ نے اعلانِ دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابو طالب سے آ کر شکایت کی ابو طالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا، لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی یعنی آنحضرت ﷺ ادائے فرض

سے باز نہ آسکتے تھے، اس لیے یہ سفارت دوبارہ ابو طالب کے پاس آئی اس میں تمام رؤسائے قریش یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابو سفیان، عاص بن ہشام، ابو جہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے، ان لوگوں نے ابو طالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے، ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لیے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے، ابو طالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے۔ قریش اب تحمل نہیں کر سکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آنحضرت ﷺ سے مختصر لفظوں میں کہا۔ "جانِ عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں" رسول اللہ ﷺ کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابو طالب تھے، آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے آپؐ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا۔ "خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لا کر دے دیں، تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا، آپؐ کی پراثر آواز نے ابو طالب کو سخت متاثر کیا۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا "جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"

آنحضرت ﷺ بدستور دعوتِ اسلام میں مصروف ہوئے، قریش اگرچہ آنحضرت ﷺ کے قتل کا ارادہ نہ کر سکے لیکن طرح طرح کی۔ اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بد زبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپؐ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں۔ انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا کر سکتا ہے؟ قریش نے بھی یہی خیال کیا۔ اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہا، محمدؐ! کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا

ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کر سکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیر فرمان ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آؤ۔ عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا، لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جا کر کہہ دیا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ جائیں گے تو یہ تمہاری ہی عزت ہے ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا۔ لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔

☆☆☆☆☆

حضرت حمزہؓ اور عمرؓ کا اسلام 6 سال نبوی

آنحضرت ﷺ کے اعمام میں سے حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے خاص محبت تھی، وہ آپؐ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کھیلے تھے، دونوں نے ثوبیہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاقِ طبیعت سپاہ گری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے قریش کے رؤسا صحن حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے۔ حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقے سے سب یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا۔ ایک دن ابوجہل نے روو در روو آپ کے ساتھ نہایت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی۔ حضرت حمزہؓ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا۔ حضرت حمزہؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے، تیر و کمان ہاتھ میں لیے حرم میں آئے اور ابوجہل سے کہا "میں مسلمان ہو گیا ہوں۔"

آنحضرت ﷺ کے جوشِ حمایت میں انہوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی ہے، دو چار روز ہی کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ حضرت عمر کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی، چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے، حضرت سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے، ان کے دشمن بن گئے۔ لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشا مارتے، اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ "دم لے لوں تو پھر ماروں گا۔" لبینہؓ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اُترتا نہ تھا۔ ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذاتِ نبوی ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے۔ کارکنانِ قضا نے کہا:

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ محمد (ﷺ) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں، انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔ فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، اُن کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لیے، لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں، انہوں نے کہا میں سن چکا ہوں تم دونوں مرتد ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریبان ہوئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ ان کا جسم لہولہان ہو گیا، لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی۔ بولیں کہ "عمر! جو بن آئے کرو، لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا۔" ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت

کی نگاہ سے دیکھا، ان کے جسم سے خون جاری تھا دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ۔ فاطمہؓ نے قرآن کے اجزاء لا کر سامنے رکھ دیئے۔ اٹھا کر دیکھا تو یہ سورۃ الحدید تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے، صحابہؓ کو تردد ہوا، لیکن حضرت حمزہؓ نے کہا۔ "آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔" حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ ﷺ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا۔ "کیوں عمر! کس ارادے سے آیا ہے؟" نبوت کی پر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا۔ نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ "ایمان لانے کے لیے۔" آنحضرت ﷺ بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا۔ اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے۔ عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہؓ سید الشہداء نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاہم مسلمان اپنے فرائض مذہبی علانیہ نہیں ادا کر سکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے ساتھ دفعۃً یہ حالت بدل گئی، انہوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اوّل اوّل بڑی شدت کی لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی۔

☆☆☆☆☆

تعذیب مسلمین

رسوخ عزم، قوتِ ارادہ، شدتِ عمل انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں لیکن انہی اوصاف کا رُخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کر لیتے ہیں اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ ﷺ اور اکابر صحابہؓ کو ان کے قبیلہ نے اپنے حصارِ حفاظت میں لے لیا تو قریش کا طیش وغضب ہر طرف سے سمٹ کر اُن غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے، جو دو ایک پشت سے مکہ میں آ رہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے جو کسی قسم کی عظمت واقتدار نہیں رکھتے تھے۔ قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور وستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سر زمین عرب دفعۃً پاک کر دی جاتی لیکن قریش کا نشۂ انتقام اس سے اتر نہیں سکتا تھا۔ مسلمان اگر اپنے مذہب پر قائم رہ کر پیوند خاک کر دیئے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی اس سے زیادہ ان بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا۔ قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر قریش کے مذہب میں آ جاتے۔ یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا اور اسکی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، ان کے آباؤ اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے،

قابل احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کر کے رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ چند خام طبعوں کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔ عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے، لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہر حال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کیے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے۔ وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے، چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کر کے اس سے داغتے، پانی میں ڈبکیاں دیتے۔ یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بے کس مسلمانوں پر عام تھیں، لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، ان کے نام یہ ہیں۔

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے تھے۔ ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت ﷺ حضرت ارقمؓ کے گھر میں موجود تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، جب چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سپید تھی۔

حضرت بلالؓ، یہ وہی حضرت بلالؓ ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا لیکن اس وقت بھی ان کی زبان سے "اَحَدْ" کا لفظ نکلتا جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا،

وہ ان کو شہر کے اس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے لیکن اب بھی وہی رٹ تھی اَحَدٌ اَحَدٌ۔

حضرت عمارؓ یمن کے رہنے والے تھے ان کے والد "یاسرؓ" مکہ میں آئے۔ ابو حذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہ تھا شادی کر دی تھی، عمارؓ اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے، قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے، ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہؓ حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں ان کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور وہ ہلاک ہوگئیں۔ حضرت یاسرؓ حضرت عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔

حضرت صہیبؓ یہ رومی مشہور ہیں لیکن درحقیقت رومی نہ تھے، ان کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے ابلہ کے حاکم تھے اور ان کا خاندان موصل میں آباد تھا، ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں حضرت صہیبؓ بھی تھے یہ روم میں پلے اس لیے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے، ایک عرب نے ان کو خریدا اور مکہ میں لایا، یہاں عبداللہ بن جدعان نے ان کو خرید کر کے آزاد کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمارؓ بن یاسر ایک ساتھ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے، آپؐ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے، جب انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا سارا مال و متاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو انہوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔

حضرت ابوفکیہہ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلالؓ کے ساتھ اسلام لائے۔ امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پاؤں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں ایک گبریلا راہ میں جا رہا تھا، امیہ

نے ان سے کہا۔ "تیرا خدا یہی تو نہیں ہے" انہوں نے کہا "میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے" اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا، ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری بوجھل پتھر رکھ دیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔

حضرت لبینہ، یہ بے چاری ایک کنیز تھیں، حضرت عمرؓ اس بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں، وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا۔

حضرت زنیرہؓ، حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ (اسلام سے پہلے) ان کو جی کھول کر ستاتے۔ ابوجہل نے ان کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلادانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں، ایک مسلمان کو بھی راہِ حق سے متزلزل نہ کر سکیں۔ ایک نصرانی مؤرخ نے نہایت سچ لکھا ہے:۔

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد ﷺ کے خصائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپؐ کے پیروؤں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے، جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے، برعکس اس کے محمد (ﷺ) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپؐ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔"

☆☆☆☆☆

ہجرت حبش 5 سال نبوی

قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمت عالم (ﷺ) نے جاں نثاران اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کی ہجرت جائیں۔

غرض آنحضرت ﷺ کے ایماء سے اوّل اوّل گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی۔

نجاشی کے بدولت مسلمان حبش میں امن وامان سے زندگی بسر کرنے لگے، لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لیے منتخب ہوئے، نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لیے گراں بہا تحفے مہیا کیے گئے اور نہایت سروسامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے، کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیئے جائیں، درباریوں نے بھی تائید کی، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا ”تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے مخالف ہے۔“

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لیے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ

کے بھائی) کو انتخاب کیا انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی:

"اَیُّهَا الْمَلِكُ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا، جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں پھر واپس آ جائیں۔"

نجاشی نے کہا جو کلامِ الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو، حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، پھر کہا خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔ یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا تم واپس جاؤ، میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے ناراض ہو جائے گا حضرت جعفرؓ نے کہا کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے، نجاشی نے کہا تم لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا، ہمارے پیغمبرؐ نے بتایا ہے کہ "عیسیٰؑ خدا کا

بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے" نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھالیا اور کہا۔"واللہ جو تم نے کہا عیسیٰؑ اس تنکے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں" بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے اُن کے غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے۔

حبش میں کم وبیش 83 مسلمان ہجرت کر کے گئے۔ چند روز آرام سے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رُخ کیا۔ لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ اس لیے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے۔

☆☆☆☆☆

محرم 7 سال نبوی، شعب ابو طالب میں محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفراء بے نیل مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لیے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قربت کرے گا، نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا جب تک وہ محمد (ﷺ) کو قتل کے لیے حوالہ نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا اور در کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابو طالب مجبور ہو کر تمام خاندانِ ہاشم کے ساتھ شعب ابو طالب میں پناہ گزین ہوئے، تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے، یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے۔ حضرت سعد وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے اس کو پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا، ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت

خدیجہؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابو البختری کہیں سے آ گیا، وہ اگرچہ کافر تھا لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے۔

مسلسل تین برس تک آنحضرت ﷺ اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کو توڑنے کی تحریک ہوئی۔ ہشام عامری خاندانِ بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا، ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے گیا اور کہا کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو۔ ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو؟ زہیر نے کہا کیا کروں تنہا ہوں ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں، ہشام نے کہا میں موجود ہوں، دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے اور ابو البختری، ابن ہاشم، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا، دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ اے اہل مکہ یہ کیا انصاف ہے؟ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو۔ خدا کی قسم! جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔ ابو جہل برابر سے بولا۔ ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی۔ مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے بقول ابن سعد یہ 10 سال نبوی کا واقعہ ہے۔

☆☆☆☆☆

10 سال نبوی

حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات

آنحضرت ﷺ اب شعب ابی طالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور وظلم سے امان ملی تھی کہ ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔

ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا، اب وہ نہایت بے رحمی اور بے باکی سے آنحضرت ﷺ کو ستاتے تھے۔

طائف کا سفر

اہل مکہ سے تو قطعی نا امیدی تھی، اس لیے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوتِ اسلام فرمائیں۔ طائف میں بڑے بڑے امراء اور اربابِ اثر رہتے تھے، انہوں نے طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپؐ کی ہنسی اڑائیں، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، یہ مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا جب آپؐ اُدھر سے گزرے تو آپ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ جب آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے تھے۔ جب آپؐ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے۔ آخر آپؐ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا اس نے آپؐ کو اس

حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا، اس سفر میں حضرت زید بن حارثہ بھی ساتھ تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حراء میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ مکہ میں تشریف لائے۔ مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا، حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد ﷺ کو پناہ دی ہے۔ آنحضرت ﷺ حرم میں آئے، نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے۔ مطعم اور اس کے بیٹے آپؐ کو تلواروں کے سایہ میں لائے۔

قبائل کا دورہ

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا جب حج کا زمانہ آتا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آ کر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپؐ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے۔

☆☆☆☆☆

رسول اللہ ﷺ کی ایذا رسانی

قریش نے آنحضرت ﷺ کی سخت مخالفت کی، اور چاہا کہ آپ کو اس قدر ستائیں کہ آپؐ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دستبردار ہو جائیں، سوءِ اتفاق یہ کہ جو کفار آپؐ کے ہمسایہ تھے یعنی ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص، سب قریش کے سربرآوردہ رؤسا تھے اور یہی سب سے بڑھ کر آپؐ کے دشمن تھے، یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپؐ کی گردن پر اوجھڑی لاکر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردنِ مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں آپؐ کی روحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنون کہتے۔ باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے۔ نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول اللہ ﷺ) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے۔

ایک دفعہ آپؐ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے، ابو جہل نے کہا کاش! اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھالاتا تاکہ جب محمد (ﷺ) سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا، عقبہ نے کہا، یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں، چنانچہ اوجھ لاکر آپ کی گردن پر ڈال دی۔ قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو خبر کی، وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور

بددعائیں دیں۔

آنحضرت ﷺ جب کہیں کسی مجمع عام میں دعوتِ اسلام کا وعظ فرماتے تو ابولہب جو آپ کے ساتھ ساتھ برابر سے کہتا جاتا کہ "یہ جھوٹ کہتا ہے۔" ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لا چکا تھا آنحضرت ﷺ بازار ذوالمجاز میں گئے اور گھس کر لوگوں سے کہا لا الہ الا اللہ کہو۔ ابوجہل آپؐ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات وعزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔ طائف میں کفار نے آپؐ کو جو اذیتیں پہنچائیں ان کا بیان پیچھے گزر چکا ہے۔

ایک دفعہ آپؐ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ نے آپؐ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے اور آپؐ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔

☆☆☆☆☆

انصار کے اسلام لانے کی ابتداء 10 سال نبوی

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ حج کے زمانہ میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے۔ اس سال (رجب 10 نبوی) میں بھی آپؐ متعدد قبائل کے پاس تشریف لے گئے۔ عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے، خزرج کے چند اشخاص آپؐ کو نظر آئے، آپؐ نے ان سے نام و نسب پوچھا۔ انہوں نے کہا "خزرج"۔ آپؐ نے دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا:

"دیکھو، یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں۔"

یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا۔ یہ چھ (6) شخص تھے۔

بیعت عقبہ اولیٰ 11 سال نبوی

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی۔ اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکامِ اسلام کے سکھانے کے لیے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے، آنحضرت ﷺ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ مصعبؓ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقین اسلام میں سے تھے۔ غزوۂ بدر میں لشکر کی علمبرداری کا منصب انہی کو ملا تھا۔ وہ مدینہ میں آ کر اسعد بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے۔ روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے

آدمی اسلام قبول کرتے۔ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر اسلام پھیل گیا۔ صرف خطمہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات میں وہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ تھے، قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ مصعبؓ نے جب ان کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے پہلے نفرت ظاہر کی، لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پھر موم تھا۔ ان کا اسلام لانا تمام قبیلۂ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

☆☆☆☆☆

بیعت عقبہ ثانیہ 12 سال نبوی

اگلے سال بہتر (72) شخص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے جو (بت پرست تھے) چھپ کر بہ مقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، انہوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا گروہ خزرج! محمد (ﷺ) اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں، دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے۔ اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی سے جواب دیدو۔

حضرت براءؓ نے آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے کہا۔ "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں۔" وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابوالہیثمؓ نے بات کاٹ کر کہا۔ یا رسول اللہؐ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں۔ بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپؐ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپؐ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں۔ آپؐ نے مسکرا کر فرمایا۔ "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں۔"

آپؐ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کیے، جن کے نام خود انصار نے پیش کیے تھے، اُن میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے، آنحضرت ﷺ نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں: شرک، چوری، زنا، قتل اولاد اور افتراء کے مرتکب نہ ہوں گے اور رسول اللہ ﷺ اُن سے جو اچھی بات کہیں گے، اس سے سرتابی نہ کریں گے۔ (صحیح بخاری)

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو سعدؓ بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا بھائیو! یہ بھی

خبر ہے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب وعجم اور جن وانس سے جنگ ہے۔

سب نے کہا، ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کیے گئے رئیس القبائل تھے۔ ان کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں، قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے، صرف آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے، جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے وہ مدت تک نہ جا سکے۔

☆☆☆☆☆

1ھ ہجرت

نبوت کا تیرھواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہؓ مدینہ پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور اسلام پھیلتا جاتا ہے اس بنا پر انہوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا اجلاس عام کیا، ہر قبیلہ کے رؤسا شریک تھے، لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا محمد کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے نے کہا جلا وطن کر دینا کافی ہے۔ ابوجہل نے کہا۔ ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا، اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے، اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آ کر رسول اللہ ﷺ کے آستانہ مبارک کا محاصرہ کر لیا، اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لیے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت ﷺ نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپؐ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال و اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپؐ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا، اس وقت بھی آپؐ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں، آپ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی اس بناء پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی

امانتیں جا کر واپس دے آنا، یہ سخت خطرہ کا موقع تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپؐ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ ﷺ کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتح خیبر کے لیے قتل گاہ فرشِ گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ ﷺ دوپہر کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے گھر پر گئے۔ دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی۔ اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا۔ کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو، بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے (اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی) آپؐ نے فرمایا، مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے نہایت بے تابی سے کہا، میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمراہی کا شرف حاصل ہو گا؟ ارشاد ہوا۔ "ہاں" حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے لیے چار مہینہ سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں۔ عرض کی کہ ان میں سے ایک آپؐ پسند فرمائیں، محسن عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا، ارشاد ہوا۔ "اچھا مگر بہ قیمت!" حضرت ابوبکرؓ نے مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی ماں تھیں سفر کا سامان کیا۔ دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی تھیں پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو "ذات النطاقین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت ﷺ ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا۔ مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔ حضرت ابوبکرؓ سے پہلے سے قرار داد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے، یہ غار آج بھی موجود ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں، جو کچھ

خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت ﷺ سے عرض کرتے، حضرت ابوبکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپؐ اور حضرت ابوبکرؓ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھیں لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچاتی تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں۔

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت ﷺ کے بجائے حضرت علیؓ تھے۔ ظالموں نے آپؓ کو پکڑ کر اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا پھر آنحضرت ﷺ کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ غم زدہ ہوئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپؐ نے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ آیت 40)

گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا۔ دفعۃً ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت ﷺ کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیئے حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں۔

چوتھے دن آپؐ غار سے نکلے، عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، رہنمائی کے لیے اجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے، دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھا دی، آنحضرت ﷺ نے آرام فرمایا تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں۔ پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد وغبار سے صاف کر دے، پھر اس کے

ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہایا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا، آپؐ نے پی کر فرمایا کہ کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا۔ آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لیے آپؐ وہاں سے روانہ ہوئے۔

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد ﷺ یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک خون بہا کے برابر (یعنی سو اونٹ) انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم نے سنا تو انعام کے لالچ میں نکلا۔ عین اس حالت میں کہ آپؐ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپؐ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ وہ گر پڑا۔ ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں "نہیں" نکلا لیکن سو اونٹوں کا گراں بہا معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا، اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی اب بھی وہی جواب تھا لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجیے۔ حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامرؓ بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امن لکھ دیا۔

☆☆☆☆☆

مدینہ میں داخلہ

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا۔ معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے تھے، پیغمبر (ﷺ) آرہے ہیں۔ لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے جاتے ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ اے اہل عرب! لوتم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا، تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سج کر بے تابانہ گھروں سے باہر نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اس کو عالیہ اور قباء کہتے ہیں، یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے، آنحضرت ﷺ یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبان دوعالم ﷺ نے انہیں کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوش عقیدت کے سلام عرض کرتے۔

تمام مورخین اور ارباب سیرت لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ یہاں آپ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا۔ حضرت کلثومؓ کی ایک افتادہ زمین تھی جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں، یہیں دست مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے:۔

وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے رہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (التوبہ آیت 108)

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپؐ خود بھی کام کرتے تھے، بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا، عقیدت مند آتے اور عرض کرتے ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، آپ چھوڑ دیں ہم اٹھا لیں گے، آپ اس کی درخواست قبول فرماتے، لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے۔

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) آپؐ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے، راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آ گیا جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا یہ آنحضرت ﷺ کی سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبہ نماز تھا، لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوشِ مسرت سے پیش قدمی کے لیے دوڑے، آپ کے ننھیالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے، قبا سے مدینہ تک دو رویہ جاں نثاران کی صفیں تھیں۔ راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آ کر عرض کرتا حضور یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے، آپؐ منت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے، شہر قریب آ گیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	چاند نکل آیا ہے
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	ہم پر خدا شکر واجب ہے
مَا دَعٰى لِلّٰهِ دَاعٍ	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ	ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں

يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ   محمد (ﷺ) کیا اچھا ہمسایہ ہے

آپؐ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا، ''کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟'' بولیں ''ہاں!'' فرمایا کہ میں بھی تم کو چاہتا ہوں۔

جہاں اب مسجد نبوی ہے اس سے متصل حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر تھا۔ حضرت ابو ایوبؓ کا مکان دومنزلہ تھا انہوں نے بالائی منزل پیش کی لیکن آپؐ نے زائرین کی آسانی کے لیے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ابو ایوبؓ دو وقتہ آپؐ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپؐ جو چھوڑ دیتے ابو ایوبؓ اور ان کی زوجہ کے حصہ میں آتا۔ کھانے میں جہاں آنحضرت ﷺ کی انگلیوں کے نشان پڑا ہوتا ابو ایوبؓ تبرک کے لیے وہیں انگلیاں ڈالتے۔

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی بہہ کر نیچے جائے اور آنحضرت ﷺ کو تکلیف ہو۔ گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا۔ حضرت ابوایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔

آنحضرت ﷺ نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا۔ اس اثنا میں جب مسجد نبویؐ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپؐ نے نقل مکان فرمایا۔

☆☆☆☆☆

مسجد نبویؐ اور ازواج مطہراتؓ کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانۂ خدا کی تعمیر تھی۔ دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس پر کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپؐ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا۔ ''میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں، وہ بولے کہ ہم قیمت لیں گے، لیکن آپ سے نہیں بلکہ خدا سے (چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی آپ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپ نے گوارا نہ کیا، حضرت ابو ایوبؓ نے قیمت ادا کی۔ قبریں اُکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ شہنشاہِ دو عالمؐ پھر مزدوروں کے لباس میں تھے۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقّف چبوترہ تھا جو صفہ کہلاتا تھا، یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو اسلام لائے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔

مسجد نبویؐ جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپؐ نے ازواجِ مطہراتؓ کے لیے مکان بنوائے۔

☆☆☆☆☆

مواخاۃ

مہاجرین مکہ معظمہ سے بے سرو سامان آئے تھے، گو ان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے اس لیے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپؐ نے انصار کو طلب فرمایا۔ حضرت انسؓ بن مالک جو اس وقت دس سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے، مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی، آنحضرت ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، پھر مہاجرین اور انصار سے دو دو شخص کو ملا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو، اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے، انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے سعدؓ بن ربیع جو عبدالرحمنؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے، ان کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمن سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کر لیجیے لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا۔

انصار کا مال و دولت جو کچھ تھا نخلستان تھے روپے پیسے تو اس زمانے میں تھے نہیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں، مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے، اس بناء پر آنحضرت ﷺ نے ان کی طرف سے انکار کیا۔ انصار نے کہا سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے، جو کچھ پیداوار ہو گی اس میں سے نصف حصہ مہاجرین کا ہو گا۔ مہاجرین نے اس کو منظور کیا۔

صفہ اور اصحاب صفہ

اصحابِ صفہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، گو اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرف واقف نہیں۔

"صفہ" سائبان کو کہتے ہیں، یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبویؐ کے ایک کنارہ پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا، صحابہؓ میں سے اکثر تو مشاغل دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت ﷺ کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے، ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لیے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہِ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑے رہتے۔ حضرت ابوہریرہؓ بھی انہی لوگوں میں تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہبند دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہوسکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی۔ اکثر انصار کھجور کی پھلی ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لگا دیتے کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھا لیتے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ آکر شریک نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ دیوانے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو پورا ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا

تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت ﷺ ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے، یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعدؓ بن عبادہ نہایت فیاض اور دولت مند تھے، وہ کبھی کبھی اسی اسی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے آنحضرت ﷺ ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں۔ راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے ان کے لیے ایک معلم مقرر تھا، اس کے ساتھ جا کر پڑھتے۔ اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لیے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہ لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوۂ معونہ میں انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھلانے کے لیے بھیجے گئے تھے، ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی۔ کل مجموعی تعداد 400 تک پہنچی تھی، لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی۔

☆☆☆☆☆

مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ

جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں، آپؐ نے انصار اور یہود کو حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا، یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔

1- خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا۔

2- یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

3- یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔

4- یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔

5- کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

6- مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

7- کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریکِ صلح ہوگا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

☆☆☆☆☆

غزوۂ بدر

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (آل عمران آیت 123)

رمضان 2ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے یہ مقام اسی نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے مدینہ منورہ سے قریبا 80 میل کے فاصلہ پر ہے۔

قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (ﷺ) کو قتل کر دو یا ہم آ کر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں۔ کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آ کر غارت گری کر گیا تھا حملہ کے لیے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا، اس لیے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروان تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سروسامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی، کل کی کل دے دی۔

آنحضرت ﷺ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ وغیرہ نے جاں نثارانہ تقریریں کیں، لیکن رسول اللہ ﷺ انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیونکہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس

وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں حضرت سعدؓ بن عبادہ (سردار خزرج) نے اٹھ کر کہا۔ "کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم! آپؐ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔"

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ "ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں۔ ہم لوگ آپؐ کے دائیں سے، بائیں سے، سامنے سے، پیچھے سے لڑیں گے" اُن کی اس تقریر سے رسول اللہ ﷺ کا چہرہ دمک اٹھا۔

غرض 12 رمضان 2ھ کو آپ تقریباً تین سو جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے۔

17 رمضان کو بدر کے قریب پہنچے، خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آ گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ یہیں رک گئے اور فوجیں اتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے، ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو سواروں کا رسالہ تھا رؤسائے قریش سب شریک تھے، عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداران نے کہا اب لڑنا ضروری نہیں۔ لیکن ابوجہل نے نہ مانا، زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے باقی فوج آگے بڑھی۔ قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا۔ زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ حضرت حبابؓ بن منذر نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ وحی نہیں ہے۔ حضرت حبابؓ نے کہا تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنوئیں بے کار کر دیئے جائیں۔ آپؐ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائیدا ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور

جابجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لیے گئے کہ غسل اور وضو کے کام آئیں۔

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا لیکن ساقی کوثر ﷺ کا فیض عام تھا، اس لیے دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت دی۔

صحابہؓ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپؐ اس میں تشریف رکھیں۔ حضرت سعدؓ بن معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔ اگرچہ بارگاہِ الٰہی سے فتح و نصرت کا وعدہ ہو چکا تھا۔ عناصر عالم آمادہ مدد تھے۔ ملائکہ کی فوجیں ہمرکاب تھیں تاہم عالم اسباب کے لحاظ سے آپؐ نے اصولِ جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں۔ مہاجرین کا علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا۔ خزرج کے علم بردار حضرت حبابؓ بن منذر اور اوس کے حضرت سعدؓ بن معاذ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپؐ نے صف آرائی شروع کی۔

یہ معرکہ ایثار اور جاں بازی کا سب بڑا حیرت انگیز منظر تھا، دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جواب تک کافر تھے) میدانِ جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ تلوار کھینچ کر نکلے۔ عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہؓ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو آئے۔ حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا، آگے بڑھا مجع حضرت عمرؓ کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردارِ لشکر تھا، ابوجہل کے طعنہ سے سخت برہم تھا۔ سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارز طلبی کی۔ عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدان جنگ میں جاتے تھے، عتبہ کے سینہ پر شتر مرغ کے پر تھے حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ مقابلے کو نکلے۔ عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصارؓ ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ محمدؐ! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد

کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے چونکہ (یہ لوگ خود پہنے تھے جس سے چہرے چھپ گئے تھے) عتبہ نے پوچھا تم کون ہو؟ سب نے نام ونسب بتائے۔ عتبہ نے کہا۔ "ہاں اب ہمارا جوڑ ہے۔"

عتبہ حضرت حمزہؓ سے اور ولید حضرت علیؓ سے مقابل ہوا اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کیا۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہؓ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے حضرت عبیدہؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا "کیا میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ آپؐ نے فرمایا "نہیں، تم نے شہادت پائی"

اب عام حملہ شروع ہو گیا، مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے لیکن ادھر سرور عالم ﷺ سر بسجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔

ابوجہل کی شرارت اور دشمنی اسلام کا عام چرچا تھا اس بنا پر انصار میں سے معوذؓ اور معاذؓ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آجائے گا یا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعۃً مجھ کو دائیں بائیں دو نوجوان نظر آئے، ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے پوچھا، برادر زادہ، ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اسے قتل کر دوں گا یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا، میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ کو کانوں میں یہی باتیں کیں۔ میں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے۔ بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا دونوں جوان عفراء کے بیٹے تھے۔ "معوذ و معاذ"۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آ کر معاذ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے باز و کٹ گیا لیکن تسمہ باقی لگا رہا۔ معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا، وہ بچ کر نکل گیا، معاذؓ اسی حالت میں لڑ رہے تھے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی۔ ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہو گیا اور اب وہ آزاد تھے۔

ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ مغربی مورخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسباب ظاہری کے نتائج ہیں، حیرت ہے کہ تین سو پیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا کیونکہ فتح ہوئی، لیکن تائید آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں۔ اول تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا۔ عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا۔ قبیلہ زہرہ کے لوگ بدر تک آ کر واپس چلے گئے۔ پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ قریش جہاں صف آراء تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا۔ قریش مرعوب ہو کر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے یعنی اپنی تعداد سے دوگنا۔

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی بخلاف اس کے آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں۔ مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے تھے صبح اٹھے تو تازہ دم تھے بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب ہیں ان کا اجتماع اور تہیہ یہی تائید الٰہی ہے۔

خاتمہ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف 14 شخصوں نے شہادت پائی جن میں 6 مہاجر اور باقی انصار تھے لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی اور رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قریش کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے، قریباً ستر (70) آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔

اسیران جنگ دو دو، چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہؓ نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا وہ ان کو کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔

اسیران جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکے تھے وہ چھوڑ دیئے گئے۔ ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے ان کو حکم

ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

آنحضرت ﷺ کے داماد ابو العاص بھی اسیرانِ جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی، آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو (جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں) کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں، حضرت زینبؓ کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں ان کو ایک قیمتی ہار دیا تھا۔ حضرت زینبؓ نے زرِ فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا آنحضرت ﷺ نے دیکھا تو 25 برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آ گیا۔ آپؐ بے اختیار رو پڑے اور صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کی ماں کی یادگار واپس کر دو سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا۔

بدر کے نتائج

بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالات پر گوناگوں اثرات پیدا کیے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدمِ اولین تھا۔ قریش کے بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی راہ میں سدِ آہن تھا، فنا ہو گئے۔ عتبہ اور ابوجہل کی موت نے قریش کی ریاست عامہ کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھا جس سے دولت اموی کا آغاز ہوا، لیکن قریش کے اصلی زور و طاقت کا معیار گھٹ گیا۔

☆☆☆☆☆

3ھ غزوۂ اُحد

وَ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ.

(آلِ عمران آیت 139)

بدر میں قریش کے ستر (70) آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاج وافسر تھے۔ اس بنا پر تمام مکہ جوشِ انتقام سے لبریز تھا۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہِ اُحد پر پڑاؤ ڈالا۔ آنحضرت ﷺ جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکلے۔ عبداللہ بن ابی تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ محمد (ﷺ) نے میری رائے نہ مانی۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ اب صرف سات سو صحابہؓ رہ گئے۔ ان میں ایک سو زرہ پوش تھے۔ مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا اور جو لوگ کم سن تھے، واپس کر دئے گئے۔

آنحضرت ﷺ نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی حضرت مصعبؓ بن عمیر کو علم عنایت کیا حضرت زبیر بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے۔ پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں، اس لیے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے انہوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی۔ میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا۔ تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا۔

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے۔ ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے۔

نَحْنُ	بَنَاتُ	طَارِقْ	ہم آسمانوں کے تاروں کی بیٹیاں ہیں
نَمْشِیْ	عَلَی	النَّمَارِقْ	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
اِنْ	تُقْبِلُوْا	نُعَانِقْ	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی
اَوْ	تُدْبِرُوْا	نُفَارِقْ	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے۔

اب عام جنگ شروع ہو گئی، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابو دجانہؓ فوجوں کے دل میں گھسے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابو دجانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آنحضرت ﷺ نے دست مبارک میں تلوار لے کر فرمایا ''کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟'' اس سعادت کے لیے دفعۃً بہت سے ہاتھ بڑھے، لیکن یہ فخر حضرت ابو دجانہؓ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے اُن کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے لیکن اس وقت پسند ہے۔ حضرت ابو دجانہؓ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہند سامنے آ گئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھا لی کہ رسول اللہ ﷺ کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہؓ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفوں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جن سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا، حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اُس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو ''حربہ'' کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۔

تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف تھا، علم برداوں کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر نازنینیں جو رجز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی، یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کیے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے۔

حضرت عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رک نہ سکے۔ تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا۔ عبداللہؓ بن جبیر چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہوئے، اب راستہ صاف تھا خالد نے سواروں کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا۔ لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں۔ بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر جو آنحضرت ﷺ سے صورت میں مشابہ اور علم بردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت ﷺ نے شہادت پائی۔ اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی۔

سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک کی نظر پڑی۔ چہرۂ مبارک پر مغفر تھا لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا۔ ''مسلمانو! رسول اللہ ﷺ یہ ہیں۔'' یہ سن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رُخ پر زور دیا۔

عبداللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا، صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت ﷺ کے قریب آ گیا اور چہرہ مبارک پر تلوار ماری۔ اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپؐ کو دائرہ میں لے لیا، ابو دجانہؓ جھک کر سپر بن گئے اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے، حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا۔ ایک ہاتھ کٹ کر گر

پڑا بے درد رحمت عالم ﷺ پر تیر برسا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے۔

رَبِّ اغْفِرْ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ.

(اے خدا! میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔)

رسول اللہ ﷺ ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آسکتے تھے۔ ابوسفیان نے دیکھ لیا۔ فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا۔ لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

آپؐ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے۔ جناب فاطمہ زہراؓ نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے۔ جناب سیدہؓ دھوتی تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا۔ بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا، خون فوراً تھم گیا۔

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ ان کے ناک کان کاٹ لیے۔ ہند (حضرت امیر معاویہؓ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا، حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی، لیکن گلے سے اتر نہ سکا اس لیے اگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر خوار لکھا جاتا ہے، اسی بنا پر لکھا جاتا ہے، ہند فتح مکہ میں ایمان لائی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ جو حضرت انسؓ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ ماں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ پائنچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ مشک خالی ہو جاتی تھی تو جا کر بھر لاتی تھیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیطؓ نے بھی جو حضرت ابوسعید خدریؓ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی۔

عین اس وقت جب کہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپؐ کے ساتھ صرف چند جان نثار رہ گئے تھے حضرت ام عمارہؓ آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ گئیں اور سینہ سپر ہو

گئیں۔ کفار جب آپ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ ابن قمیہ جب ورانا ہوا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ گیا تو حضرت ام عمارہؓ نے بڑھ کر روکا۔ چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا۔ انہوں نے بھی تلوار ماری لیکن وہ دہری زرہ پہنچے ہوئے تھے اس لیے کارگر نہ ہوئی۔

حضرت صفیہؓ (حضرت حمزہؓ کی بہن) شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیرؓ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیرؓ نے آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا۔ بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں، لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اجازت دی۔ لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے لیکن اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر چپ ہو رہیں اور مغفرت کی دعا مانگی۔

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے تھے، باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی، لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں۔ اس نے پاس آ کر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی۔

كُلُّ مُصِيْبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ

(تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔)

میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا
اے شہِ دیںؐ تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمی مارے گئے، جن میں زیادہ تر انصار تھے لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہداء کی پردہ پوشی ہو سکتی۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر ایک صحابی تھے کہ ان کا پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا۔ تو پاؤں کھل جاتا آخر پاؤں اذخر کی گھاس سے چھپا دیئے گئے یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی یہ واقعہ مسلمانوں کو یاد آ جاتا تو آنکھیں تر ہو جاتیں۔ شہداء بے

غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا۔

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے تاہم یہ خیال کر کے کہ ابوسفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو، آپؐ نے مسلمانوں کی طرف رو۔۔ خطاب کر کے فرمایا کہ کون ان کا تعاقب کرے گا۔ فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لیے تیار ہو گئی، جن میں حضرت ابوبکرؓ و زبیرؓ بھی داخل تھے۔

ابوسفیان ۔۔ سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا۔ یہاں خیال آیا کہ کام نا تمام رہ گیا۔ آنحضرت ﷺ کو پہلے ہی سے گمان تھا۔ دوسرے ہی دن آپؐ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی ۔۔ نہ جائے، چنانچہ حمراء اسد تک جو مدینہ سے 8 میل ہے تشریف لے گئے۔ قبیلۂ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا لیکن در پردہ اسلام کا طرف دار تھا، اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واپس جا کر ابو سفیان سے ملا۔ ابوسفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، معبد نے کہا میں دیکھتا آتا ہوں محمد (ﷺ) اس سروسامان سے آ رہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے غرض ابوسفیان واپس گیا۔

☆☆☆☆☆

ذوقعدہ 5ھ

غزوۂ احزاب یعنی عرب کی متحدہ جنگ

بنونضیر مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انہوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی۔ اُن کے رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حیّ بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کر دیا جا سکتا ہے۔ قریش اس کے لیے ہمیشہ تیار تھے، قریش کو آمادہ کرکے یہ لوگ قبیلۂ غطفان کے پاس گئے اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل ان کو ہمیشہ دیا کریں گے اس لیے یہ فوراً تیار ہو گئے، بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے ان کو لکھ بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ۔ قبیلہ بنوسلیم سے سے قریش کی قرابت تھی۔ اس تعلق سے انہوں نے بھی ساتھ دیا۔ بنوسعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے ان کو بھی آمادہ کیا۔ غرض تمام قبائل عرب سے لشکر گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا۔ فتح الباری میں تصریح ہے کہ ان کی تعداد (دس ہزار) تھی۔

آنحضرت ﷺ نے یہ خبریں سنیں تو صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقہ سے واقف تھے، انہوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں، ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے۔ خندق دراصل فارسی کندہ کا معرب ہے جن کے معنی کھودے گئے کے ہیں کاف "خ" سے اور ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے، جس طرح پیادہ سے بیدق ہو

گیا ہے۔

تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کیے گئے مدینہ میں تین جانب مکانات او رنخلستان کا سلسلہ تھا جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا، صرف شامی رُخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے تین ہزار صحابہؓ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ ذوقعدہ 5ھ کی 8 تاریخ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے حدود خود قائم کیے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی۔ خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا۔ بیس دن میں 3 ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔

یاد ہوگا کہ جب مسجد نبوی بن رہی تھی تو سرور دوجہاںؐ مزدوروں کی صورت میں تھے آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے۔ جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن کا فاقہ ہے، مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد لاد کر پھینکتے ہیں اور جوش محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں۔

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آ گئی۔ کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ آپؐ نے دستِ مبارک سے پھاوڑا مارا تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی۔

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں۔

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک دن صحابہؓ نے بے تاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں، لیکن جب آپؐ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے، محاصرہ اس قدر شدید اور پر خطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں سے خطاب کرکے فرمایا کہ کوئی ہے جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے؟ تین دفعہ آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی آنحضرت ﷺ نے اس موقع پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب دیا۔

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، اُدھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ کے اہل وعیال یہیں قلعوں میں پناہ گزین تھے۔ محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس لیے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے، آنحضرت ﷺ نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دیں تھیں، جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتی تھیں۔ ایک حصہ خود آپؐ کے اہتمام میں تھا۔ محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپؐ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ انصار ہمت ہار جائیں، اس لیے آپؐ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے، حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت سعد بن معاذ کو جو رؤسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا۔ دونوں نے عرض کی اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ یہ استقلال دیکھ کر آپ کو اطمینان ہوا۔ حضرت سعدؓ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹا دی اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب، جبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا۔ ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا تھا، خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لیے باہر سے پتھر اور تیر برسانے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی اس لیے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے۔ تمام فوجیں یکجا ہوئیں۔ قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے، خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی، یہ موقع حملہ کے لیے انتخاب کیا گیا۔ عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدود نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدود تھا وہ ایک ہزار سوار کے برابر تھا۔ عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے؟ حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "میں"۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے

روکا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے۔ حضرت علیؓ بیٹھ گئے۔ لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا۔ عمرو نے دوبارہ پکارا اور پھر وہی ایک صدا جواب میں تھی، تیسری دفعہ جب آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے تو حضرت علیؓ نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے۔ غرض آپؐ نے اجازت دی، خود دست مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو نے آگے بڑھ کر وار کیا حضرت علیؓ نے سپر پر روکا لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی پیشانی پر لگی۔ گو زخم کاری نہ تھا تاہم یہ طغرا آپؓ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا، دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علیؓ نے وار کیا ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی، ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا، تمام دن لڑائی رہی، کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینہ برسا رہے تھے اور ایک دم کے لیے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی۔ یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی متصل چار نمازیں قضا ہوئیں، متصل تیراندازی اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا، یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا۔ ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ حضرت صفیہؓ (آنحضرت ﷺ کی پھوپھی) نے دیکھ لیا۔ مستورات کی حفاظت کے لیے حضرت حسانؓ (شاعر) متعین کر دیئے گئے تھے۔ حضرت صفیہؓ نے ان سے کہا کہ اتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا، حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، اس بناء پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا۔ حضرت صفیہؓ چلی آئیں اور حسانؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ۔ حسانؓ نے کہا

جانے بھی دیجئے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں۔ لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینا پڑی۔ یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت نہ کی۔

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے، دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا۔ پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آ گیا۔ خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولہوں پر الٹ الٹ جاتے تھے۔ اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا۔

بہر حال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ ابو سفیان نے فوج سے کہا رسد ختم ہو چکی۔ موسم کا یہ حال ہے یہود نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اب محاصرہ بے کار ہے، یہ کہہ کر طبل رحیل بجنے کا حکم دیا۔ غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے، بنو قریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق 20، 22 دن تک غبار آلود ہو کر صاف ہو گیا۔

☆☆☆☆☆

6ھ صلح حدیبیہ و بیعت رضوان

مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں۔ گاؤں بھی اسی کنوئیں کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چونکہ معاہدۂ صلح یہیں لکھا گیا اس لیے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی، تاہم خدا نے قرآن مجید میں اس کو فتح کا لقب دیا ہے۔

اسلام کے فرائض چہارگانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم ہے، غرض مختلف اسباب سے آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری ہتھیار سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے، 1400 شخص اس سفر میں ہمرکاب ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں، یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے، ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیئے گئے۔

احتیاط کے لیے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے، جب قافلہ عسفان کے قریب

پہنچا اس نے آ کر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد مکہ میں کبھی نہیں آ سکتے۔ غرض قریش نے بڑے زور و شور سے مقابلہ کی تیاری کی۔ قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا وہ جمعیت عظیم لے کر آئے، مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں۔ خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے، دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جُحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آ گئے ہیں اس لیے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔ فوج اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی۔ وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آ گیا۔ آنحضرت ﷺ آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا لیکن اعجاز نبویؐ سے اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

بیعت رضوان

بالآخر آپؐ نے گفتگوئے صلح کے لیے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے، یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی، تمام صحابہؓ نے جن میں مرد و زن دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعۃ الرضوان ہے۔ سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا. (الفتح آیت 18)

خدا مسلمانوں سے راضی تھا جب کہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا تو خدا نے ان پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو خطیب قریش کا خطاب دیا تھا۔ قریش نے ان سے کہہ دیا صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کی شرائط پر گفتگو رہی۔ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں۔ حضرت علیؓ نے عنوان پر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتداء میں بِاسْمِکَ اَللّٰھُمَّ لکھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے وہ آشنا نہ تھے۔ اس بناء پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں، آنحضرت ﷺ نے منظور فرمایا۔ آگے کا فقرہ تھا۔ یہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے تسلیم کیا۔ سہیل نے کہا اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا۔ آپؐ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن خدا کی قسم! میں خدا کا پیغمبر ہوں، یہ کہہ کر آپؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو۔ حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گزار ہو سکتا تھا لیکن عالم محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں جہاں فرمانبرداری سے انکار کرنا پڑتا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا! اچھا مجھ کو دکھاؤ میرا نام کہاں ہے؟ حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی۔ آپؐ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا۔

آنحضرت ﷺ کو لکھنا نہیں آتا تھا اسی بناء پر آپ کو "امی" کہتے ہیں، یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے لکھا کہ آپؐ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر "ابن عبداللہ" لکھ دیا۔ بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے اس لیے ایک معرکۃ الآراء مباحثہ بن گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روز مرہ جب نظر سے گزرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے حرف آشنا ہو جاتا ہے اس سے امیت میں فرق نہیں آتا۔ بے شبہ امی ہونا آپ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف و عزت کے موقع پر

استعمال ہوا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (اعراف آیت 19)

شرائط صلح یہ تھیں۔

(1) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

(2) اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

(3) ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جُلُبّان (تھیلا وغیرہ) میں۔

(4) مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

(5) کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

(6) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، اتفاق یہ کہ عین اس وقت جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابوجندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید رکھا تھا اور طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے۔ سہیل نے کہا محمد (ﷺ) صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے۔ اس (ابو جندلؓ) کو شرائط صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا۔ سہیل نے کہا، تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اچھا ان کو یہیں رہنے دو۔ سہیل نے نامنظور کیا۔ آپؐ نے چند دفعہ اصرار کیا، لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً آنحضرت ﷺ کو تسلیم کرنا پڑا۔ ابوجندلؓ کو کافروں نے اس طرح مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے، مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا برادران اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا

چاہتے ہو؟ میں اسلام لاچکا ہوں۔ کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو؟ تمام مسلمان تڑپ اٹھے۔ حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا یا رسول اللہ (ﷺ)! کیا آپؐ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ''ہاں ہوں'' حضرت عمرؓ نے کہا کیا ہم حق پر نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا، ہاں ہم حق پر ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ خدا میری مدد کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔ حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ وہ پیغمبر خدا ہیں جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں اُن سے سرزد ہوئیں تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لیے انہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کیے۔

اس حالت کا گوارا کرنا گو صحابہؓ کی طاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا، ایک طرف (ظاہر میں) اسلام کی توہین ہے۔ حضرت ابوجندلؓ بیڑیاں پہنے، 14 سو جاں نثارانِ اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ ﷺ کا ذرا ایماء ہو جائے تو تلوار فیصلہ قاطع کے لیے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوجندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

> ابوجندلؓ! صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لیے اور مظلوموں کے لیے کوئی راہ نکالے گا، صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے بدعہدی نہیں کر سکتے۔

غرض حضرت ابوجندلؓ کو اسی طرح پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل

شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا، یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا۔ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لیے بال منڈوائیں۔ آپؐ نے باہر آ کر خود قربانی کی اور بال منڈائے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔ صلح کے بعد تین دن تک آپؐ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ آیت اتری۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (فتح۔1)

(ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔)

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ اس معاہدۂ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لائے کہ کبھی نہیں لائے تھے۔

☆☆☆☆☆

سلاطین کو اِسلام کی دعوت

آخر 6ھ یا شروع 7ھ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا۔ اَیُّھَا النَّاسُ! خدا نے مجھ کو تمام دنیا کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو حوارینِ عیسیٰؑ کی طرح اِخلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو۔ اس کے بعد آپؐ نے قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے ان کی تفصیل یہ ہے۔

حضرت دحیہؓ کلبی	قیصرِ روم
حضرت عبداللہؓ بن حذافہ سہمی	خسرو پرویز کجکلاہِ ایران
حضرت حاطبؓ بن (ابی) بلتعہ	عزیزِ مصر
حضرت عمروؓ بن امیہ	نجاشی بادشاہِ حبش
حضرت سلیطؓ بن عمر بن عبدشمس	رؤسائے یمامہ
حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدی	رئیس حدودِ شام، حارث غسانی

☆☆☆☆☆

فتح خیبر 7ھ

خیبر میں چھ قلعے تھے سالم، قموص، نطاۃ، قصارۃ، شق، مربط اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے، ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔ مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا اسی قلعہ کا رئیس تھا۔ ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلا وطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکر اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقام صہباء میں پہنچا تو نماز عصر کا وقت آ چکا تھا آنحضرت ﷺ نے یہاں ٹھہر کر نماز عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا، رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا، وہی آپؐ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا، رات ہوتے ہوتے فوج اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی۔ عمارتیں نظر آئیں تو آپؐ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ۔ پھر خدا کا نام لے کر یہ دعا مانگی۔

اے خدا! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور گاؤں والوں کی اور گاؤں کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپؐ کا معمول عام تھا۔ یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے۔ چونکہ سنت نبویؐ یہ تھی کہ رات کو مقام پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا اس لیے رات یہیں بسر کی، صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا، یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا۔ رسد اور غلہ قلعہ ناعم میں یکجا کیا اور فوجیں قلعہ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں، سلام بن مشکم بیمار تھا، تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا

اور خود قلعہ نطاۃ میں آ کر فوج میں شرکت کی۔

آنحضرت ﷺ کا مقصود جنگ نہ تھا، لیکن جب یہود نے بڑے سروسامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تو آپؐ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا اور جہاد کی ترغیب دی۔

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمودؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا اور دیر تک لڑتے رہے لیکن چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لیے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ کنانہ بن الربیع نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ ان کے سر پر گرایا جس کے صدمہ سے وفات پائی لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔

ناعم کے بعد اور قلعے بہ آسانی فتح ہوتے گئے لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے۔

جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا اور جو خدا اور خدا کے رسولؐ کو چاہتا ہے اور خدا اور خدا کا رسولؐ اس کو چاہتے ہیں۔ یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی۔ صحابہؓ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھیں یہ تاج فخر کس کے ہاتھ آتا ہے حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سروری کی تمنا نہیں کی لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علی میں مذکور ہے، اُن کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔ صبح کو دفعتاً یہ آواز کانوں میں آئی کہ "علیؓ کہاں ہیں؟" یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی کیونکہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں، غرض حسب طلب وہ حاضر ہوئے، آنحضرت ﷺ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا اور دُعا فرمائی۔ جب اُن کو علم عنایت ہوا تو انہوں نے عرض کی کہ کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں، ارشاد ہوا کہ "بہ نرمی ان پر اسلام کو پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے۔

مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا۔

خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں، تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں۔

مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا۔

میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا میں شیر نیستاں کی طرح مہیب و بدمنظر ہوں۔

مرحب بڑے طمطراق سے آیا لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی دانتوں تک اتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی۔

غرض یہ قلعہ (قموص) 20 دن کے محاصرہ سے بعد فتح ہو گیا، ان معرکوں میں 93 یہود مارے گئے جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، عامر زیادہ مشہور ہیں۔ صحابہؓ میں سے 15 بزرگوں نے شہادت حاصل کی۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضے میں رہنے دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت ﷺ عبداللہ بن رواحہ کو بھیجتے تھے۔ وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں جو حصہ چاہو لے لو۔ یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔ خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے، تقسیم کر دی گئی اسی میں آنحضرت ﷺ کا خمس بھی تھا۔

☆☆☆☆☆

غزوۂ موتہ

جمادی الاولیٰ 8ھ

موتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقاء سے اس طرف ہے عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں وہ یہیں بنتی تھیں۔

آنحضرت ﷺ نے شاہ بُصرٰی یا قیصر روم کے نام ایک خط لکھا تھا۔ عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمران تھے ان میں ایک شرحبیل بن عمرو بھی تھا جو اسی علاقہ بلقاء کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔ یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران تھا، یہ خط حارثؓ بن عمر لے کر گئے تھے۔ شرحبیل نے ان کو قتل کر دیا۔ اس کے قصاص کے لیے آنحضرت ﷺ نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ زیدؓ بن حارثہ کو جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے سپہ سالاری ملی اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیارؓ اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ فوج کے سردار ہوں، حضرت زیدؓ غلام تھے گو آزاد ہو چکے تھے، حضرت جعفر طیارؓ، حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت ﷺ کے مقرب خاص تھے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ و حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کے ہوتے حضرت زیدؓ کو افسر کرنا کس بناء پر ہے؟ چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوئے لیکن اسلام جس مساوات عام کے قائم کرنے کے

لیے آیا تھا اس کے لیے اسی قسم کا ایثار درکار تھا۔ حضرت اسامہؓ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا آنحضرت ﷺ نے انہی زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے آنحضرت ﷺ نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے، گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا، ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوت اسلام دی جائے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی حکم ہوا کہ اظہار ہمدردی کے لیے اس مقام پر جانا جہاں حارثؓ بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی ہے، ثنیۃ الوداع تک آنحضرت ﷺ خود فوج کی مشایعت کے لیے تشریف لے گئے۔ صحابہؓ نے پکار کر دُعا کی کہ خدا سلامت اور کامیاب لائے۔

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرحبیل کو خبر دی۔ جس نے مقابلہ کے لیے کم و بیش ایک لاکھ فوج تیار کی۔ ادھر خود قیصر روم (ہرقل) قبائل عرب کی بے شمار فوج لے کر تاب میں خیمہ زن ہوا جو بلقاء کے اضلاع میں ہے۔ حضرت زیدؓ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات سے دربار رسالت کو اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے لیکن حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے کہا، ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولت شہادت ہے جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔

غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زیدؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے علم ہاتھ میں لیا۔ گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی تلواروں اور برچھیوں کے 90 زخم تھے لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا، حضرت جعفرؓ کے بعد عبداللہؓ بن

رواحہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

اب خالدؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے، صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں، لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا کیا مقابلہ تھا بڑی کامیابی یہی تھی کہ اپنی فوجوں کو دشمنوں کی زد سے بچا لائے۔

☆☆☆☆☆

فتح مکہ

رمضان 8ھ مطابق جنوری 630ء

صلح حدیبیہ کی بناء پر قبائل عرب میں خزاعہ آنحضرت ﷺ کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا، ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں۔ اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رُک گئیں اور اب تک رُکی رہیں۔ کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا، صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آ گیا، دفعتا وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوئے اور رؤسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی۔ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں۔ خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی، بنو بکر رُک گئے کہ حرم کا احترام ضرور ہے لیکن ان کے رئیس اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آ سکتا غرض عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔

آنحضرت ﷺ نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا تاہم آپؐ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔

(1) مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

(2) قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(3) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی۔ انہوں نے ابوسفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کا معاہدہ کی تجدید کرا لائیں۔ ابوسفیان نے مدینہ آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں درخواست کی، بارگاہ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا، ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا، بالآخر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کے ایماء سے مسجد نبویؐ میں اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی۔

ابوسفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں، احتیاط کی گئی کہ اہل مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے انہوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں، آنحضرت ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی، حضرت علیؓ (اور حضرت زبیرؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت ابومرثدؓ غنوی) کو بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں۔ خط آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی، حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں؟ لیکن جبین رحمت پر شکن نہ تھی، ارشاد ہوا عمرؓ! تم کو کیا معلوم ہے کہ خدا نے اہل بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے۔

حضرت حاطبؓ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں ان کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آپ نے قبول فرمایا۔

غرض 10 رمضان 8ھ کو کوکبہ نبویؐ نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا، دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائل عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے

مرالظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت ﷺ کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا۔ فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔

لشکر اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھے۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا۔ ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا یہ کون لشکر ہے؟ حضرت عباسؓ نے نام بتایا دفعۃً سردار فوج حضرت سعدؓ بن عبادہ ہاتھ میں علم لیے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے۔

"آج گھمسان کا دن ہے آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔"

سب سے اخیر کوکبہ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا۔ حضرت زبیرؓ بن العوام علمبردار تھے۔ ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ "حضورؐ نے سنا؟ سعد بن عبادہؓ کیا کہتے ہوئے گئے، ارشاد ہوا کہ "سعد بن عبادہؓ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے" یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعد بن عبادہؓ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔ مکہ پہنچ کر آپؐ نے حکم دیا کہ علم نبویؐ مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ حضرت خالدؓ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کر لے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا اس کو امن دیا جائے گا، تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالدؓ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صحابہ نے شہادت پائی۔ حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر حملہ کیا یہ لوگ 13 لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

آنحضرت ﷺ نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالدؓ سے باز پرس کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتداء مخالفین نے کی تو آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "قضائے الٰہی یہی تھی۔"

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے جن کو قریش خدا مانتے تھے۔ آنحضرت

ﷺ نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں۔ حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے، کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا آپؐ حضرت بلالؓ اور طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

☆☆☆☆☆

خطبۂ فتح

شاہنشاہِ اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا۔ خطبۂ سلطنت یعنی بارگاہ حدیث کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ ﷺ نے ادا کی جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں بلکہ تمام عالم سے تھا۔

ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اس نے اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا۔ ہاں تمام مفاخر، تمام انتقامات خون بہائے قدیم، تمام خون بہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں، اے قومِ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔

پھر قرآن مجید کی آیت پڑھی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے پہچان لیے جاؤ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوت اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لیے سب سے پہلے اسی سے ابتداء کی گئی۔

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ ﷺ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت ﷺ کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت ﷺ کی ایڑیوں

کو لہولہان کر دیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمت عالم ﷺ نے اُن کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا"

"تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔"

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے پکار اٹھے کہ:

"تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے۔"

ارشاد ہوا:

"تم پر کچھ الزام نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے بامِ کعبہ پر چڑھ کر اذان دی۔ وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے، ان کی آتش غیرت پھر مشتعل تھی۔ عتاب بن اُسید نے کہا:

خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اُٹھا لیا۔ (1) ایک اور سردار نے کہا "اب جینا بے کار ہے۔" (2)

مقام صفا میں آپؐ ایک بلند مقام پر بیٹھے۔ جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے، آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکانِ اسلام اور محاسن اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا۔ پھر پانی کے لبریز پیالہ میں آنحضرت ﷺ دست مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے۔ (3) آپؐ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی۔ یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی۔ حضرت حمزہؓ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

(1) ابن ہشام

(2) اصابہ

(3) طبری

غزوۂ حُنین

شوال 8ھ

وَ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ

حُنین

حنین، مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔

شوال 8ھ مطابق جنوری و فروری 630ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ اس سروسامان سے حُنین پر بڑھیں کہ بعض صحابہؓ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ

"آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے؟"

تقسیم غنائم

محاصرہ چھوڑ کر آپؐ جعرانہ تشریف لائے، غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق آپؐ نے انتظار کیا۔ ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے، لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا۔ مالِ غنیمت کے پانچ حصے کیے گئے۔ چار حصے حسب قاعدہ اس فوج کو تقسیم کیے گئے، خمس بیت المال اور غرباء و مساکین کے لیے رکھا گیا۔

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس اونٹ عطا فرمائے۔ عام تقسیم کی رو

سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں، چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا اس لیے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے، اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے یہ چرچے سنے۔ انصار کو طلب فرمایا، ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے، آپؐ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ حضور! ہمارے سر برآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔ صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا آپؐ نے جو سنا صحیح ہے۔

آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا۔

> "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعہ تم کو دولت مند کیا۔"

آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

آپؐ نے فرمایا۔ "نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (ﷺ) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو

مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی"

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ "تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد (ﷺ) کو لے کر اپنے گھر آؤ۔"

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمد ﷺ درکار ہیں۔" اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں، آپؐ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں دیا بلکہ تالیف قلب کے لیے دیا۔

☆☆☆☆☆

غزوۂ تبوک

رجب ۹ھ مطابق نومبر 635ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے۔

جنگ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا، مذہباً عیسائی تھا۔ اس لیے قیصر روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا۔

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انہوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں جمع کر دی ہیں، اس بناء پر آنحضرت ﷺ نے فوج کی تیاری کا حکم دیا، سوءِ اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا۔

چونکہ رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے تمام قبائل عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی۔ صحابہ میں سے حضرت عثمانؓ نے دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو اونٹ پیش کیے۔ اکثر صحابہ نے بڑی بڑی رقمیں لا کر حاضر کیں تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور اس درد سے روئے کہ آنحضرت ﷺ کو ان پر رحم آیا، تاہم ان کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہو سکا۔

آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جب آپؐ مدینہ سے تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے۔ چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواج مطہراتؓ ساتھ نہیں گئی تھیں۔ اہل حرم کی حفاظت کے لیے کسی عزیز خاص کا رہنا ضروری تھا اس لیے اب کے یہ منصب جناب امیرؓ کو ملا لیکن انہوں نے شکایت کی کہ آپؐ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی۔

غرض آپؐ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے جس میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ راہ میں وہ عبرت ناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا، آپؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پئے اور نہ کسی کام میں لائے۔

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی، غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا۔ صحیح بخاری (غزوہ تبوک) میں جہاں حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ مذکور ہے لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعبؓ بن مالک کو رئیس غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ محمد (ﷺ) نے تمہاری قدر نہ کی، اس لیے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا۔ حضرت کعبؓ معتوب نبویؐ تھے لیکن انہوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت ﷺ نے بیس دن تک قیام کیا۔ ایلہ کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضر خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا، ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا۔ جس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی۔

تبوک سے جب آپؐ واپس پھر اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالم شوق میں استقبال کو نکلے، یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ

جب تک خدا کا پکارنے والا کوئی دنیا میں باقی ہے ہم پر خدا کا شکر فرض ہے

☆☆☆☆☆

جنگی اصلاحات

جنگ افعالِ انسانی کا بدترین منظر ہے۔ عرب کی جنگ تو ظلم و توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندہ پن کا تماشا گاہ تھی۔ لیکن اعجاز نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرضِ انسانی بن گئی۔

لڑائی عبادت بن گئی

اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے، اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی۔ جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے۔ جابر اور ظالم، کمزور آدمیوں پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں۔

☆☆☆☆☆

سیرت النبی ﷺ

جلد دوم (2)

وفودِ عرب

تمام عرب مکہ کے فیصلۂ اخیر کا انتظار کر رہا تھا، مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دارالاسلام میں جا کر کوئی فیصلہ کرے، اہل عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں سرکشی نہیں کر سکتے۔ لیکن خیبر وغیرہ کی نظیروں سے یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام لانے پر وہ مجبور نہیں ہیں، بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کر کے ان کی سابق حالت قائم رہ سکتی ہے۔

فتح مکہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہو گئیں اور بجز چند کے باقی جس قدر سفارتیں آئیں، انہوں نے بارگاہِ نبوت میں پہنچ کر وہ کچھ دیکھا کہ واپس آئے تو ایمان کی دولت سے مالا مال آئے۔

☆☆☆☆☆

سال اخیر، حجۃ الوداع، اختتام فرضِ نبوت

ذی الحجہ 10ھ مطابق فروری 632ء

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُo وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا o فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَ اسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ کَانَ تَوَّابًاo(النصر)

(جب خدا کی مدد آ گئی اور مکہ فتح ہو چکا اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں فوج کی فوج داخل ہو رہے ہیں تو خدا کے حمد کی تسبیح پڑھ اور استغفار کر، خدا توبہ قبول کرنے والا ہے۔)

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ نصرت اور فتح کے مقابلہ میں شکر کی ہدایت ہونی چاہیے تھی، تسبیح اور استغفار کو فتح سے کیا مناسبت ہے؟ اس بنا پر ایک صحبت میں حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے۔ لوگوں نے مختلف معنی بتائے، حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا، وہ کم سن تھے اور جواب دیتے جھجکتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی ڈھارس بندھائی، تو انہوں نے کہا کہ یہ آیت آنحضرت ﷺ کے قربِ وفات کا اعلان ہے کہ استغفار موت کے لیے مخصوص ہے۔

اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آ گیا ہے، اس لیے اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت اور اخلاق کے تمام اصولِ اساسی کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے ہجرت کے

زمانہ سے اب تک فریضۂ حج ادا نہیں فرمایا تھا، ایک مدت تک تو قریش سد راہ رہے، صلح حدیبیہ کے بعد موقع ملا لیکن مصالح اس کے مقتضی تھے کہ یہ فرض سب سے آخر میں ادا کیا جائے۔

بہر حال ذو قعدہ میں اعلان ہوا کہ آنحضرت ﷺ حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے جا رہے ہیں، یہ خبر دفعۃً پھیل گئی اور شرف ہمرکابی کے لیے تمام عرب اُمنڈ آیا (سنیچر کے دن) ذو قعدہ کی 26 تاریخ کو آپ ﷺ نے غسل فرمایا اور اور چادر اور تہمد باندھی، نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے اور تمام ازواج مطہرات ؓ کو ساتھ چلنے کا حکم دیا، مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذوالحلیفہ ایک مقام ہے جو مدینہ کی میقات ہے یہاں پہنچ کر (شب بھر اقامت فرمائی، دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، حضرت عائشہ ؓ نے اپنے ہاتھ سے آپ ﷺ کے جسم مبارک پر عطر ملا) اس کے بعد آپ ﷺ نے دو رکعت نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہو کر احرام باندھا اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے۔

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ
اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ.

اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں، اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں۔ ہم حاضر ہیں تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے اور سلطنت میں کوئی تیرا شریک نہیں۔

نو (9) دن کے بعد مکہ پہنچے۔ کعبہ کا طواف کیا۔ طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم میں دو نفل پڑھے، پھر صفا سے اتر کر مروہ پر تشریف لائے، یہاں بھی دعا و تہلیل کی۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے، صفا و مروہ کی سعی سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے ان لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے، عمرہ تمام کر کے احرام اتارنے کا حکم دیا۔ بعض صحابہ نے گزشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجا آوری میں معذرت کی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر میرے ساتھ قربانی کے اونٹ نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ حضرت علی ؓ کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے۔ اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لے کر مکہ میں وارد ہوئے چونکہ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے اس لیے انہوں نے احرام نہیں

اتارا۔ جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا۔ دوسرے دن نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے۔

قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لیے نکلتے تھے تو عرفات کے بجاوے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے جو حرم کے حدود میں تھا، ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کیے تو ان کی شانِ یکتائی میں فرق آ جائے گا، لیکن اسلام کو جو مساوات عام قائم کرنی تھی اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جا سکتی تھی، اس لیے (خدا نے حکم دیا) ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ۔ (البقرہ آیت 99) آپ بھی عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات میں آئے، عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے، آپ نے ایک کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا، دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ پر (جس کا نام قصواء تھا) سوار ہو کر میدان میں آئے اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا۔

آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا اور جاہلیت کے تمام بے ہودہ مراسم کو مٹا دیا اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا۔

اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِیَّةِ تَحْتَ قَدَمِیْ مَوْضُوْعٌ۔

(صحیح مسلم وابوداؤد)

(ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔)

تکمیل انسانی کی منزل میں سب سے بڑا سنگ راہ امتیاز مراتب تھا، جو دنیا کی تمام قوموں نے، تمام مذاہب نے، تمام ممالک نے مختلف صورتوں میں قائم رکھا تھا۔ سلاطین سایۂ یزدانی تھے جن کے آگے کسی کو چون و چرا کی مجال نہ تھی، ائمہ مذاہب کے ساتھ کوئی شخص مسائل مذہبی میں گفتگو کا مجاز نہ تھا۔ شرفاء رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھی، غلام آقا کے ہمسر نہیں ہو سکتے تھے، آج یہ تمام فرقے، یہ تمام امتیازات، یہ تمام حد بندیاں دفعتاً ٹوٹ گئیں۔

"لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔
تمہارے غلام، تمہارے غلام، جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو
وہی ان کو پہناؤ۔"

عرب میں کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہوتا تو اس کا انتقام لینا خاندانی فرض ہوجاتا تھا، یہاں تک کہ سینکڑوں برس گزر جانے پر بھی یہ فرض باقی رہتا تھا اور اسی بنا پر لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا اور عرب کی زمین ہمیشہ خون سے رنگین رہتی تھی۔ آج سب سے قدیم رسم عرب کا سب سے مقدم فخر خاندان کا پر فخر مشغلہ برباد کر دیا جاتا ہے (اور اس کے لیے نبوت کا منادی سب سے پہلا اپنا نمونہ آپ پیش کرتا ہے)

"جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیئے گئے اور
سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کے
بیٹے کا خون باطل کر دیتا ہوں۔"

تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا ہوا تھا جن سے غرباء کا ریشہ ریشہ جکڑا ہوا تھا اور ہمیشہ کے لیے وہ اپنے قرض خواہوں کے غلام بن گئے تھے، آج وہ دن ہے کہ اس جال کا تار تار الگ ہوتا ہے، اس فرض کی تکمیل کے لیے بھی معلم حق سب سے پہلے اپنے خاندان کو پیش کرتا ہے۔

"جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے
پہلے اپنے خاندان کا سود (عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل
کرتا ہوں)۔"

آج تک عورتیں ایک جائیداد منقولہ تھیں جو قمار بازی میں داؤ پر چڑھا دی جا سکتی تھیں، آج پہلا دن ہے کہ یہ گروہ مظلوم، یہ صنف لطیف، یہ جوہر نازک قدر دانی کا تاج پہنتا ہے۔

"عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔ تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا

تم پر حق ہے۔"

عرب میں جان و مال کی کچھ قیمت نہ تھی جو شخص چاہتا تھا قتل کر دیتا تھا اور جس کا مال چاہتا تھا چھین لیتا تھا، آج امن و سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے۔

"تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔"

اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے لیکن ان کی بنیاد صاحب شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی ان کو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں، بندوں کی ہوس پرستیوں نے ان کی حقیقت گم کر دی تھی، ابدی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایات ربانی کا مجموعہ تھی، اپنے ہاتھ سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے۔

"میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو تم گمراہ نہ ہو گے وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا۔

خدا نے ہر حق دار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا، اب کسی کو وراثت کے حق میں وصیت جائز نہیں۔

لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا۔ زنا کار کے لیے پتھر ہے اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔

جو لڑکا اس باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے آقا کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے۔

ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، مانگی ہوئی چیز واپس کی جائے، عطیہ لوٹایا جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔"

یہ فرما کر آپ ﷺ نے مجمع کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ   کیوں میں نے پیغامِ خداوندی سنا دیا۔

سب بول اٹھے، ہاں! فرمایا۔

اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ   اے خدا! تو گواہ رہنا۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ.

(جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں جو موجود نہیں۔)

خطبہ کے اختتام پر آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو الوداع کہا۔

☆☆☆☆☆

وفات

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَ اِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ (زمر)

ربیع الاوّل 11ھ مطابق مئی 623ء

روح قدسی کو عالم جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی کہ تکمیل شریعت اور تزکیۂ نفوس کا عظیم الشان کام درجۂ کمال تک پہنچ جائے، حجۃ الوداع میں یہ فرض اہم ادا ہو چکا، توحید کامل اور مکارمِ اخلاق کے اصول عملاً قائم کر کے عرفات کے مجمع عام میں اعلان کر دیا گیا کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ
(المائدہ آیت 3)

(آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔)

سورۂ نصر کا نزول خاص خاص صحابہ کو آنحضرت ﷺ کے قرب وفات کی اطلاع دے چکا تھا اور آپ ﷺ حکم ربانی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ (نصر) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح و تہلیل میں بسر فرماتے تھے، آپ عموماً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے لیکن رمضان 10ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے۔ سال میں ایک دفعہ ماہِ رمضان میں آپ ﷺ پورا قرآن ناموس اکبر کی زبانی سنتے تھے،

لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر مناسکِ حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ مجھے امید نہیں کہ آئندہ سال تم سے مل سکوں، بعض رواتیوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں۔ شاید میں اس کے بعد حج نہ کر سکوں۔

غزوۂ اُحد کے بیان میں گزر چکا ہے کہ شہدائے اُحد کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی، تمام غزوات میں صرف غزوۂ احد ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بے کسی کے ساتھ جان دی، اس لیے ان کی یاد آپؐ کے دل میں اس وقت بھی موجود تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیض دیدار سے مشرف فرمایا اور ان کو حسرت کے ساتھ الوداع کیا۔ شہدائے احد جو بَلْ اَحْیَاءٌ کے مژدۂ جانفزاء سے فیض یاب تھے، آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپ ﷺ نے اُن کو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ اسی زمانہ میں اُن کی قبر پر تشریف لے گئے اور اُن کے لیے دعائے خیر فرمائی اور اس رقت انگیز طریقہ سے اُن کو الوداع کیا کہ جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزہ کو وداع کرتا ہے، اس کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا۔ میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک، مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے، مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے، لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اس کے لیے آپس میں کشت و خون نہ کرو، تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔

غزوات میں گزر چکا ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حدودِ شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا، آنحضرت ﷺ اُن سے اس کا قصاص لینا چاہتے تھے، آغازِ علالت سے ایک روز پہلے آپ ﷺ نے اسامہ بن زیدؓ کو مامور کیا کہ وہ فوج لے کر جائیں اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں۔ 18 یا 19 صفر 11ھ میں آدھی رات کو آپ ﷺ

جنت البقیع میں جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا تشریف لے گئے، وہاں سے واپس تشریف لائے تو مزاج نا ساز ہوا۔ یہ حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا اور روز چہار شنبہ تھا پانچ دن تک آپ ﷺ اس حالت میں بھی۔ ازراہ عدل وکرم باری باری ایک ایک بیوی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے، دوشنبہ کے دن، مرض میں شدت ہوئی تو ازواج مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہؓ کے گھر قیام فرمائیں، خلق عمیم کی بناء پر اجازت بھی صاف اور علانیہ نہیں طلب کی بلکہ پوچھا کہ کل میں کس کے گھر رہوں گا۔ دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہؓ کے یہاں قیام فرمانے کا تھا، ازواج مطہرات نے مرضی سمجھ کر عرض کی کہ آپ ﷺ جہاں چاہیں قیام فرمائیں۔ ضعف اس قدر ہو گیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لائے۔

آمدورفت کی قدرت جب تک رہی آپ ﷺ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ ﷺ نے پڑھائی وہ مغرب کی نماز تھی، سر میں درد تھا، اس لیے سر میں رومال باندھ کر آپ ﷺ تشریف لائے اور نماز ادا کی جس میں سورۃ المرسلات قراءت فرمائی، عشاء کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضور کا انتظار ہے، لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، پھر اٹھنا چاہا کہ غش آ گیا۔ افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے پھر وہی پہلا جواب دیا، آپ ﷺ نے پھر غسل فرمایا اور پھر جب اٹھنا چاہا تو غش آ گیا، افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا اور لوگوں نے وہی جواب دیا۔ تیسری دفعہ جسم مبارک پر پانی ڈالا پھر جب اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہو گئی، جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ نے معذرت کی کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! ابوبکرؓ نہایت رقیق القلب ہیں، آپ ﷺ کی جگہ اُن سے کھڑا نہ ہوا جائے گا، آپؐ نے پھر بھی حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں، چنانچہ کئی دن تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے تین وصیتیں فرمائیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے۔ دوسری یہ کہ سفیروں کا اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح آپ ﷺ کے زمانہ میں دستور تھا، تیسری وصیت راوی کو یاد نہیں رہی اسی دن ظہر کی نماز کے وقت آپ ﷺ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپ ﷺ پر ڈالی جائیں غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے، جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، آہٹ پاکر حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹے، آپ ﷺ نے اشارہ سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی آپ ﷺ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے۔

نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے ایک خطبہ دیا، جو آپ ﷺ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا، آپ ﷺ نے فرمایا۔

"خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت) میں جو کچھ ہے اس کو قبول کرے، لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے۔ لوگوں نے ان کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپ ﷺ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ یہ رونے کی کون سی بات ہے، لیکن راز دار نبوت سمجھ چکا تھا وہ بندہ خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنی تقریر سلسلہ آگے بڑھایا اور فرمایا سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے، مسجد کے رُخ کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے، ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے، دیکھو تم ایسا نہ کرنا، میں منع کر جاتا ہوں۔"

زمانۂ علالت میں انصار آپؐ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کر کے روتے تھے،

ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گزر ہوا، انہوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی انہوں نے بیان کیا کہ حضور ﷺ کی صحبتیں یاد آتی ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب نے جا کر آنحضرت ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آج اس کی تلافی کا موقع تھا، اس لیے اس کے بعد آپ ﷺ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ یَاَیُّھَا النَّاسُ! میں انصار کے معاملہ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں، عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک، وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے۔ اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے جسم میں (بمنزلہ) معدہ کے ہیں۔ جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اس کو چاہیے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا ہوئی ہے ان کو معاف کرے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کو بھیجنا آنحضرت ﷺ نے تجویز کیا تھا، اس کی سرداری اسامہؓ بن زید کو تفویض فرمائی تھی، اس پر لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے نوجوان کو یہ منصب کیوں عطا ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا۔

> ''اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ زید کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم! وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے۔''

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے، پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکامِ الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے، چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منجر ہو چکی تھی، اور اس کے نتائج پیش نظر ہے، اس لیے ارشاد فرمایا۔

حرام و حلال کی نسبت میری طرف نہ کی جائے، میں نے وہی حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اُس کی ذاتی عمل پر ہے، آپ ﷺ نے فرمایا۔

"اے خدا کے نبی کی بیٹی فاطمہ! اور اے خدا کے نبی کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لیے کچھ کرلو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ ﷺ حجرۂ عائشہ میں واپس تشریف لائے۔

آپ ﷺ کو حضرت فاطمہ زہراؓ سے بے حد محبت تھی۔ اثنائے علالت میں ان کو بلا بھیجا تشریف لائیں تو اُن سے کچھ کان میں باتیں کیں۔ وہ رونے لگیں، پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا پہلی دفعہ آپ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا۔ جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تم ہی مجھ سے آ کر ملو گی، تو ہنسنے لگی۔

یہود و نصاریٰ نے انبیاء کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط کی تھی وہ بت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اسلام کا فرضِ اولین بت پرستی کی رگ و ریشہ کا استیصال کرنا تھا، اس لیے حالت مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپ ﷺ کے پیش نظر تھی یہی تھی اتفاق سے بعض ازواج مطہراتؓ نے جو حبشہ ہو آئی تھیں، اسی حالت میں وہاں کے عیسائی معبدوں کا اور ان کے مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا، ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مر جاتا ہے، تو اس کے مقبرہ کو عبادت گاہ بنا لیتے ہیں اور اس کا بت بنا کر اس میں کھڑا کرتے ہیں، قیامت کے روز اللہ عزوجل کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں گے۔ عین کرب کی شدت میں جب کہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر اُلٹ دیتے تھے حضرت عائشہؓ نے زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے۔

"یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی

قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔"

اسی کرب اور بے چینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا کہ عائشہؓ! وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمد (ﷺ) خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ ان کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو

وفات سے ایک دن پہلے اتوار کو لوگوں نے دوا پلانی چاہی، چونکہ گوارا نہ تھی، آپ ﷺ نے انکار فرمایا، اسی حالت میں غشی طاری ہو گئی، لوگوں نے منہ کھول کر دوا پلا دی۔ افاقہ کے بعد آپ ﷺ کو احساس ہوا تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے۔ معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی تھی ان میں حضرت عباسؓ شامل نہ تھے، اس لیے وہ اس حکم سے مستثنیٰ رہے۔ محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضا تھا، یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے، آپ ﷺ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا، لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنک مزاجی نہیں بلکہ لطف طبع تھا۔

مرض میں اشتداد اور تخفیف ہوتی رہتی تھی، جس دن وفات ہوئی (یعنی دو شنبہ کے روز) بظاہر طبیعت کو سکون تھا، حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا، آپ ﷺ نے صبح کے وقت پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ فجر کی نماز میں مشغول تھے۔ دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے آہٹ پا کر خیال کیا کہ آپ باہر آنا چاہتے ہیں، فرط مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہو گئے اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے جو امام تھے چاہا کہ پیچھے ہٹ جاویں آپ ﷺ نے اشارہ سے روکا اور حجرۂ شریف میں داخل ہو کر پردے ڈال دیئے (صحیح مسلم میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے۔ یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہؓ نے جمال اقدس زیارت کی، حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے یعنی سپید ہو گیا تھا۔

دن جیسے چڑھتا جاتا تھا آپ ﷺ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور پھر افاقہ ہو

جاتا تھا۔ حضرت فاطمہ زہراؓ یہ دیکھ کر بولیں۔ "وا کرب اباہ" ہائے میرے باپ کی بے چینی! آپ ﷺ نے فرمایا، تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ "پیغمبروں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خواہ موت کو قبول کریں یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں۔"

اس حالت میں اکثر آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے۔

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ.

(ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا۔)

اور کبھی یہ فرماتے۔

اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى

(خداوند! بڑے رفیق ہیں۔)

وہ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقت الٰہی مطلوب ہے۔

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن خدمت اقدس میں آئے۔ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے سینہ پر سر ٹیک کر لیٹے تھے، عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں مسواک تھی، مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہؓ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں، عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی اور خدمت اقدس میں پیش کی۔ آپ ﷺ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی، آپ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آ رہا تھا، سہ پہر تھی، سینہ میں سانس کی گھڑگھڑاہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لب مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سنے۔

اَلصَّلٰوةُ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ.

(نماز اور غلام)

پاس پانی کی لگن تھی، اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرہ پر ملتے۔ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے تھے۔ اتنے میں ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کیا اور تین دفعہ فرمایا۔

بَلِ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى (اب کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے۔)
یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے، آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں اور روح پاک عالم قدس میں پہنچ گئی۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ صَلٰوةً كَثِيْرًا.

☆☆☆☆☆

تجہیز و تکفین

تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ 2 ربیع الاول کو شروع ہوا، اس تاخیر کے متعدد اسباب تھے۔

(1) عقیدت مندوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ حضور ﷺ نے اس دنیا کو الوداع کہا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت ﷺ نے وفات پائی اس کا سر اڑا دوں گا۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے تمام صحابہؓ کے سامنے خطبہ دیا کہ حضور ﷺ کا اس جہان سے تشریف لے جانا یقینی تھا اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا۔

(2) اس کے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ غروبِ آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین سے فراغت ہو سکے۔

(3) قبر کنی کا کام غسل و کفن کے بعد شروع ہوا، اس لیے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔

(4) جس حجرہ میں آپ ﷺ نے وفات پائی تھی۔ وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے اور نماز جنازہ ادا کرتے تھے اس لیے بھی بڑی دیر لگی اور سہ شنبہ کا دن گزر کر رات کو فراغت ملی۔

تجہیز و تکفین کی خدمت خاص اعزہ و اقارب نے انجام دی۔ فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ نے پردہ کیا اور حضرت علیؓ نے غسل دیا۔ حضرت عباسؓ بھی موقع پر موجود تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ ان ہی نے پردہ بھی کیا تھا۔ چونکہ اس شرف میں ہر شخص

شریک ہونا چاہتا تھا اس لیے حضرت علیؓ نے اندر سے کواڑ بند کر لیے تھے، انصار نے دروازہ پر آواز دی کہ خدا کے لیے ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھیے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت گزاری میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ میں کسی کا حق نہیں ہے اس لیے اگر سب کو اجازت دی گئی تو کام رہ جائے گا، لیکن (انصار کے اصرار پر) حضرت علیؓ نے اوس ابن خولی انصاری کو جو اصحاب بدر میں تھے اندر بلا لیا، وہ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے، حضرت علیؓ نے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، حضرت عباسؓ اور ان کے دونوں صاحبزادے قثم اور فضل جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے اور اسامہ بن زیدؓ اوپر سے پانی ڈالتے تھے۔

تین سوتی سفید کپڑے جو سحول کے بنے ہوئے تھے کفن میں دیئے گئے ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا۔

غسل و کفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے، وہیں دفن بھی ہوتا ہے۔" چنانچہ نعش مبارک اٹھا کر اور بستر الٹ کر حجرۂ عائشہؓ میں اسی مقام پر قبر کھودنا تجویز ہوا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ آپ ﷺ کو کسی میدان میں اس لیے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ ﷺ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرط عقیدت سے میری قبر کو بھی عبادت گاہ نہ بنا لیں، میدان میں اس کی دارو گیر مشکل تھی، اس لیے حجرہ کے اندر دفن کیا گیا۔

مدینہ میں دو صاحب قبر کھودنے میں ماہر تھے، حضرت ابوعبیدہؓ جراح اور ابوطلحہؓ حضرت ابوعبیدہؓ اہل مکہ کے دستور کے مطابق صندوقی قبر کھودتے تھے اور ابوطلحہؓ مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی، لوگوں میں اختلاف پیش آیا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اختلاف مناسب نہیں، دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجا جائے جو پہلے آ جائے۔ لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا۔ حضرت عباسؓ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے، اتفاق یہ کہ حضرت ابوعبیدہؓ گھر پر موجود نہ تھے، ابوطلحہؓ آئے اور ان ہی نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی جو لحدی یعنی بغلی تھی چونکہ زمین نم تھی اس لیے جس

بستر پر آپؐ نے وفات پائی تھی وہ قبر میں بچھا دیا گیا۔

جنازہ تیار ہو گیا تو لوگ نماز کے لیے ٹوٹے۔ جنازہ حجرے کے اندر تھا، باری باری سے لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے تھے۔ پہلے مردوں نے، پھر عورتوں نے اور پھر بچوں نے نماز پڑھی لیکن کوئی امام نہ تھا۔

جسم مبارک کو حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے قبر میں اُتارا۔

☆☆☆☆☆

متروکات

آنحضرت ﷺ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائیداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے، جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے۔

"ہم (انبیاء کا) کوئی وراث نہیں ہوتا، جو چھوڑا، عام مسلمانوں کا حق ہے۔"

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرے وارث اشرفی بانٹ کر نہیں پائیں گے، یعنی نہ ہو گی نہ پائیں گے، چنانچہ یاد ہوگا کہ وفات کے وقت چند دینار حضرت عائشہؓ کے پاس امانت تھے، آپ ﷺ نے اسی وقت نکلوا کر خیرات کرا دیئے۔

عمرؓو بن حویرث سے جو ام المومنین جویریہؓ کے بھائی تھے، بخاری میں روایت ہے:

"آنحضرت ﷺ نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا، نہ درہم، نہ دینار، نہ غلام، نہ لونڈی اور نہ کچھ اور صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار اور کچھ زمین جو عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے۔"

ابو داؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے:

"آنحضرت ﷺ نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری۔"

بہر حال متروکات میں اگر تھیں تو تین چیزیں تھیں، کچھ زمین، سواری کے جانور اور ہتھیار۔

شمائل

شکل ولباس وطعام و مذاقِ طبیعت

حُلیۂ اقدس

آپ میانہ قد اور موزوں اندام تھے، رنگ سفید سرخ تھا، پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے۔ ناک مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا یعنی بہت پر گوشت نہ تھا، دہانہ کشادہ تھا، دندان مبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا اور سینہ کشادہ اور فراخ، سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے، نہ بالکل سیدھے تھے، ریش مبارک گھنی تھی، چہرہ کھڑا کھڑا تھا، آنکھیں سیاہ و سرگیں اور پلکیں بڑی بڑی تھیں، شانے پر گوشت اور مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینہ مبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے، ہتھیلیاں پر گوشت اور چوڑی کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں نازک اور ہلکی تھیں، پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے، نیچے سے پانی نکل جاتا تھا۔

صحابہؓ پر آپ ﷺ کے حسن و خوبروئی کا بہت اثر پڑتا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن سلام جو پہلے یہودی تھے، پہلے پہلے جب چہرۂ اقدس پر ان کی نظر پڑی ہے تو بولے "خدا کی قسم! یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں۔" جابرؓ بن سمرہ ایک صحابی ہیں ان سے کسی نے پوچھا آپ ﷺ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا، بولے "نہیں ماہ و خورشید کی طرح" یہی صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک شب کو جب مطلق ابر نہ تھا اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ ﷺ کو دیکھتا اور کبھی چاند کو دیکھتا تھا، تو آپ ﷺ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے، حضرت براءؓ

صحابی کہتے ہیں کہ میں نے کسی جوڑے والے کو سرخ (خط) کے لباس میں آپ ﷺ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا۔

آپ ﷺ کے پسینہ میں ایک طرح کی خوشبو تھی، چہرہ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح ڈھلکتے تھے۔ جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا رنگ نہایت کھلتا تھا، آپ ﷺ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دیبا اور حریر بھی آپ ﷺ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے اور مشک و عنبر میں بھی آپ ﷺ کے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی۔

عام طور پر مشہور ہے کہ آپ ﷺ کے سایہ نہ تھا، اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

مہر نبوت

شانوں کے بیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر خاتم نبوت تھی، یہ بظاہر سرخ اُبھرا ہوا گوشت سا تھا، صحیح مسلم اور شمائل ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے۔

رایت الخاتم بین کتفی رسول اللہ ﷺ غدۃ حمراء مثل بیضۃ الحمامۃ.

(میں نے آنحضرت ﷺ کے دونوں شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ تھا۔)

لیکن ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے پاس چند مہاسوں کی مجموعی ترکیب سے ایک مستدیر شکل پیدا ہو گئی تھی، اسی کو مہر نبوت کہتے تھے، تمام صحیح روایات کی تطبیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں شانوں کے درمیان ایک ذرا ابھرا ہوا گوشت کا حصہ تھا جس پر تل تھے اور بال اُگے ہوئے تھے۔

موئے مبارک

سر کے بال اکثر شانے تک لٹکے رہتے تھے، فتح مکہ میں لوگوں نے دیکھا تو شانوں پر چار گیسو پڑے تھے، مشرکین عرب بالوں میں مانگ نکالتے تھے، آنحضرت ﷺ چونکہ کفار کے مقابلہ میں اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، ابتداء میں آپ ﷺ بھی

اہل کتاب کی طرح بال چھوڑے ہوئے رکھتے تھے۔ پھر مانگ نکالنے لگے۔ یہ شمائل ترمذی کی روایت ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرکین کا وجود نہ رہا تو ان کی مشابہت کا احتمال بھی جاتا رہا، اخیر زمانہ میں مانگ نکالنے لگے۔

بالوں میں اکثر تیل ڈالتے تھے، اور ایک دن بیچ کنگھی کرتے تھے، ریش مبارک میں گنتی کے چند بال سفید ہونے پائے تھے۔

رفتار بہت تیز تھی، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ڈھلوان زمین پر اتر رہے ہیں

ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سایہ نہ تھا، یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا، لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور ناقابل اعتبار ہیں۔

گفتگو اور خندہ و تبسم

گفتگو نہایت شیریں اور دلآویز تھی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، ایک ایک فقرہ الگ ہوتا کہ سننے والوں کو یاد رہ جاتا۔ معمول تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین دفعہ فرماتے جس بات پر زور دینا ہوتا بار بار اس کا اعادہ فرماتے۔ حالت گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی، آواز بلند تھی حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کعبہ میں قرآن پڑھتے تھے اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ہند تھا اور وہ نہایت خوش تقریر تھے۔ جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے ان سے پوچھا آنحضرت ﷺ کیونکر تقریر فرماتے تھے؟ انہوں نے کہا آپ ﷺ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے تھے ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا، ہاتھ سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے، کسی بات پر تعجب کرتے تو ہتھیلی کا رُخ پلٹ دیتے، تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے اور یہی آپ ﷺ کی ہنسی تھی، جریر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو دیکھا ہو اور مسکرا نہ دیا ہو، روایتوں میں

آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ کو زیادہ ہنسی آتی تو داڑھ کے دانت (نواجذ) نظر آنے لگتے، لیکن ابن القیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرزِ ادا کا مبالغہ ہے ورنہ کبھی آپ ﷺ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں۔

لباس

لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا۔ عام لباس چادر، قمیص اور تہبند تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا۔ لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا، حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا، موزوں کی عادت نہ تھی لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے، آپ ﷺ نے استعمال فرمائے۔ بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے۔ عمامہ کا شملہ کبھی دوشِ مبارک پر، کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا، کبھی تحت الحنک کے طور پر لپیٹ لیتے تھے۔ عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی، اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے کہ ہم میں اور مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں۔

چادر

لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں پسند تھیں، جن کو عربی میں حبرہ کہتے ہیں۔

عبا

بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہے جس کی آستین اس قدر تنگ تھی کہ وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا۔ نوشیروانی قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف (کناری) تھی استعمال کی ہے۔

کمبل

جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور

گاڑھے کی ایک تہمد نکال کر دکھائی کہ ان ہی کپڑوں میں آپ ﷺ نے وفات پائی۔

حُلّۂ حمراء

روایتوں میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حُلّۂ حمراء بھی استعمال کیا ہے۔ حمراء کے معنی سرخ کے ہیں، اس لیے اکثر محدثین نے وہی عام معنی لیے ہیں لیکن ابن القیم نے اصرار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ سرخ لباس آپ ﷺ نے کبھی نہیں پہنا اور نہ مردوں کے لیے اس کو جائز رکھتے تھے، حلہ حمراء ایک قسم کی یمنی چادر تھی جس میں سرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں، اس بناء پر اس کو حمراء کہتے تھے اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے، عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں، زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے، مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے سیاہ، سرخ، سبز زعفرانی ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں، لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا۔ بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوئی تھی۔ نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں، یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے، بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے ہوتے تھے، چار پائی بان کی بنی ہوئی ہوتی تھی جس سے اکثر جسم پر بدھیاں پڑ جاتی تھیں۔

انگوٹھی

جب آپ ﷺ نے نجاشی اور قیصر روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی سلاطین مہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے، اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال فرماتے تھے، اور داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے۔

خود و زِرہ

لڑائیوں میں زِرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے، اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں، تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا۔

غذا اور طریقۂ طعام

اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پر تکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے یہاں تک جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے تمام عمر آپ ﷺ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی تاہم بعض کھانے آپ ﷺ کو نہایت مرغوب تھے۔

مرغوب کھانے

سرکہ، شہد، حلوہ، روغن زیتون، کدو خصوصیت کے ساتھ پسند تھے، سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اس کی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈتے، ایک دفعہ ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے۔ بولیں کہ سرکہ ہے فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو اس کو نادار نہیں کہہ سکتے۔ عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس حیس کہتے ہیں یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے، آپ ﷺ کو یہ بہت مرغوب تھا۔

ایک دفعہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور عبداللہ بن عباس سلمیٰؓ کے پاس گئے اور کہا آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت ﷺ کو بہت مرغوب تھا، بولیں تم کو وہ کیا پسند آئے گا؟ لوگوں نے اصرار کیا تو انہوں نے جو کا آٹا پیس کر ہانڈی میں چڑھا دیا، اوپر سے روغن زیتون اور زیرہ اور کالی مرچیں ڈالیں، پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا کہ یہ آپ ﷺ کی محبوب ترین غذا تھی۔

گوشت کے اقسام میں سے آپ ﷺ نے دُنبہ، مرغ، بٹیر (حباری) بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے۔ دست کا گوشت بہت پسند تھا، شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہٖ آپ ﷺ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لیے جب کبھی مل جاتا تو آپ ﷺ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے۔ دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لیے آپ ﷺ اس کی فرمائش کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپ ﷺ کو یہ گوشت پسند تھا۔

حضرت صفیہؓ کے نکاح میں جب آپ ﷺ نے ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا تو صرف

کھجور اور ستو تھا، تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے، پتلی ککڑیاں پسند تھیں، ایک دفعہ معوذ بن عفراء کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی ککڑیاں خدمت میں پیش کیں۔ بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے۔

پانی، دودھ، شربت

ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا، دودھ کبھی خالص نوش فرماتے، کبھی اس میں پانی ملا دیتے۔ کشمش، کھجور، انگور، پانی میں بھگو دیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جاں فرماتے۔ کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا، روایت میں اسی قدر ہے، قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا، اس لیے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا۔

معمولاتِ طعام

دسترخوان پر جو کھانا آتا اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے، لیکن اس کو برا نہ کہتے، جو سالن سامنے ہوتا اسی میں ہاتھ ڈالتے، اِدھر اُدھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے۔ کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک لگا کر نہ کھاتے اور اس کو ناپسند فرماتے، میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا، خواہ زمین سے کسی قدر اونچی میز ہوتی تھی، عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے، چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی، یعنی امراء اور اہل جاہ کے لیے مخصوص تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اس پر کھانا پسند نہیں فرمایا۔ کھانا صرف انگلیوں سے کھاتے، گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے، صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے، ابو داؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت چھری سے نہ نکالو کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے لیکن ابو داؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس حدیث کے راوی ابو معشر نجیح ہیں جن کی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں اور ان ہی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے۔

خوش لباسی

گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ ﷺ کو نفرت تھی، لیکن کبھی کبھی آپ ﷺ نہایت قیمتی اور خوشنما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ جب حروریہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے۔ حروریہ نے کہا کیوں ابن عباس یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہو، میں نے آنحضرت ﷺ کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نہایت متقشف تھے، ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلّہ مول لیا، گھر پر آکر دیکھا تو اس میں سرخ دھاریاں تھیں جا کر واپس لے کر آئے، کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماءؓ (حضرت عائشہؓ کی بہن) سے کہا انہوں نے آنحضرت ﷺ کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا جس کی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی (بعض امراء و سلاطین آنحضرت ﷺ کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ بھیجے۔ آپ ﷺ نے قبول فرمایا اور کبھی زیب تن کیے۔

مرغوب رنگ

رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی آپ ﷺ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے۔ سفید رنگ بھی بہت پسند تھا فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے۔

نامرغوب رنگ

سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے۔ ایک دفعہ عبداللہ بن عمروؓ سرخ کپڑے پہن کر آئے تو فرمایا یہ کیا لباس ہے؟ عبداللہؓ نے جا کر آگ میں ڈال دیا آپ ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی کسی عورت کو دے دیا ہوتا۔

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو مغرہ کہتے ہیں اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے، یہ رنگ آپ ﷺ کو نہایت ناپسند تھا، ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے

کپڑے رنگ رہی تھیں، آپ ﷺ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے گئے۔ حضرت زینبؓ سمجھ گئیں، کپڑے دھو ڈالے، آنحضرت ﷺ دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا۔

ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر آیا تو آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ایک دفعہ صحابہؓ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈال دی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے، فوراً صحابہؓ نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینک دیں۔

خوشبو کا استعمال

خوشبو آپ ﷺ کو بہت پسند تھی۔ کوئی خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے۔ ایک خاص قسم کا خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سکہ کہتے ہیں یہ ہمیشہ آپؐ کے استعمال میں رہتا تھا۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ ﷺ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا۔ اکثر فرمایا کرتے مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے۔

لطافت اور نفاست پسندی

مزاج میں لطافت تھی۔ ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے۔ ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تم کو کچھ مقدور ہے؟ بولا ہاں۔ ارشاد ہوا کہ خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے۔ عرب تہذیب و تمدن سے کم آشنا تھے، مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے، آپ ﷺ اس کو نہایت ناپسند فرماتے، دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے۔ ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا، ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا اور اس جگہ خوشبو لا کر ملی، آپ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین کی۔

سواری کا شوق

گھوڑے کی سواری آپ ﷺ کو نہایت مرغوب تھی آپ ﷺ فرمایا کرتے الخیل معقود فی نواصیھا الخیر (گھوڑوں کی پیشانیوں میں بھلائی رکھی گئی ہے۔) گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اونٹ پر آپ ﷺ نے سواری فرمائی ہے، آپ ﷺ کے خاص سواری کے گھوڑے کا نام لحیف تھا گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دُلدل اور دتیہ اور اونٹنیوں کا نام قصواء اور غضباء تھا۔

☆☆☆☆☆

اخلاق نبوی ﷺ

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

حضرت رسالت پناہ ﷺ کی حیاتِ اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آ کر آپ ﷺ کی زندگی تمام انبیاء کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے، تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف، اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی واعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائے گی، دنیا کے تمام مصلحین اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے، لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلح اعظم (بودھ) عملاً کیا تھا؟ کوہِ زیتون کے رحیمانہ اخلاق کا واعظ (مسیح) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا، لیکن اسکی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زریں مقولوں کی تائید میں تم کو معلوم ہے؟ لیکن مکہ کا معلّم اسی پکار کر کہتا تھا۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (الصف آیت 2)

(جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو۔)

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا۔ انسانوں کے مجمع عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا، اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا تھا، بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون راز دان ہو سکتا ہے، چند صاحبوں نے آ کر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرت ﷺ کے اخلاق بیان کیجیے انہوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟

”آپ ﷺ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔“

موجودہ صحائف آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان

کا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے، قرآن مجید لاکھوں مخالفین و اہل عناد کی بھیڑ میں اپنے داعی حق کی نسبت گویا تھا۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ. (الاعلیٰ آیت 4)

(اے محمد (ﷺ)! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔)

بے درد نکتہ چین آج تیرہ سو برس کے بعد آپ ﷺ کو سنگ دل کہتے ہیں، لیکن اس وقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، قرآن خود دشمنوں کے مجمع میں آپ ﷺ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا انْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران آیت 159)

(خدا کی عنایت سے تم ان سے بہ نرمی پیش آتے ہو، اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے آس پاس سے ہٹ جاتے۔)

دوسری جگہ کہتا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (التوبہ آیت 128)

(تمہارے پاس تم میں سے خود ایک پیغمبر آیا، اس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گزرتی ہے تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے، اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے۔)

مسئلہ اخلاق کی نسبت ایک بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف رحم و رافت اور تواضع و خاکساری کو پیغمبرانہ اخلاق کا مظہر قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ اخلاق وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر تہہ میں اور واقعات کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے۔ دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ، صغیر و کبیر، مفلس و تونگر، صلح و جنگ، خلوت جلوت، غرض ہر جگہ اور ہر ایک تک دائرۂ اخلاق کی وسعت ہے۔ آنحضرت ﷺ کے عنوانِ اخلاق پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے۔

☆☆☆☆☆

اخلاقِ نبوی ﷺ کا جامع بیان

اس سے پہلے کہ حضور انور ﷺ کے اخلاق مبارکہ کے جزئی اور تفصیلی واقعات لکھے جائیں، ان صاحبوں کے بیانات زیر تحریر آتے ہیں جنھوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سالہا سال اور مدت ہائے دراز بسر کی ہیں اور جو آپ کے اخلاق و عادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف تھے۔

انسان کے حالات کا واقف کار بیوی سے بڑھ کر دنیا میں کون ہو سکتا ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد 25 برس تک آپ ﷺ کی خدمت زوجیت میں رہی تھیں، زمانہ آغاز وحی میں آپ ﷺ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں۔

> "ہرگز نہیں! خدا کی قسم! خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔"

امہات المؤمنین میں میں حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی نے آپ ﷺ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کیے ہیں۔ فرماتی ہیں:

"آنحضرت ﷺ کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی، برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ درگزر کرتے تھے، اور معاف فرما دیتے تھے۔ آپ ﷺ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو، ورنہ آپ ﷺ اس سے بہت دور ہوتے، آپ ﷺ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی

معاملہ میں انتقام نہیں لیا، لیکن جو احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتا خدا اس سے انتقام لیتا تھا، (یعنی خدا کی طرف سے بموجب احکامِ ربانی آپ ﷺ اس پر حد جاری فرماتے تھے) آپ ﷺ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، آپ ﷺ نے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو، جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، آپ ﷺ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو۔ آپ ﷺ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں ہنستے اور مسکراتے ہوئے، دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے۔"

حضرت علیؓ جو آنحضرت ﷺ کے تربیت یافتہ تھے اور آغاز نبوت سے آخر تک کم از کم 23 برس آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں رہے تھے، ایک دفعہ حضرت امام حسینؓ نے ان سے آپ ﷺ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا، فرمایا:

"آپ ﷺ خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے، کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ ﷺ کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے، کوئی آپ ﷺ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس کرتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے، یعنی صراحۃً انکار و تردید نہیں کرتے تھے بلکہ خاموش رہتے تھے اور مزاج شناس آپ ﷺ کے تیور سے آپ ﷺ کا مقصد سمجھ جاتے تھے، اپنے نفس سے تین چیزیں آپ ﷺ نے بالکل دور کر دی تھیں، بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا، دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ کسی کو برا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا، جب آپ ﷺ کلام کرتے صحابہؓ اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جب آپ ﷺ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے، کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر

ہنستے آپ ﷺ بھی مسکرا دیتے، جن پر لوگ تعجب کرتے آپ ﷺ بھی کرتے، کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپ ﷺ تحمل فرماتے، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی آپ ﷺ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے۔ جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپ ﷺ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے، نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعۃً آپ ﷺ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ ﷺ سے محبت کرنے لگتا۔"

ہندؓ بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت ﷺ کے آغوش پروردہ تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

"آپ ﷺ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہ رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اس کو برا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ ﷺ کو غصہ آجاتا اور اس کی پوری حمایت کرتے، لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپ ﷺ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا۔"

☆☆☆☆☆

ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ معاشرت

حضرت خدیجہؓ

سلسلۂ نسب یہ ہے:

خدیجہؓ بنت خویلد بن اسعد بن عبدالعزیٰ بن قصی، قصی پر پہنچ کر ان کا خاندان رسول اللہ ﷺ کے خاندان سے مل جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، ان کی والدہ فاطمہ بنت زاہدہ تھیں، ان کے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے، مکہ میں آ کر سکونت اختیار کی اور بنو عبدالدار کے حلیف بنے، عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا، ان کے بطن سے حضرت خدیجہؓ پیدا ہوئیں، ان کی پہلی شادی ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی، ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے ایک کا نام ہند تھا اور دوسرے کا حارث، ابوہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عایذ مخزومی کے عقدِ نکاح میں آئیں ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا۔

اسی بنا پر حضرت خدیجہؓ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ہند نے اول اسلام قبول کیا، آنحضرت ﷺ کا مفصل حلیہ ان ہی کی روایت سے منقول ہے، نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل میں شریک تھے اور شہید ہوئے۔

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ ﷺ کے عقدِ نکاح میں

آئیں جس کے مفصل حالات گزر چکے، آنحضرت ﷺ سے چھ اولادیں ہوئیں، دو صاحبزادے کہ دونوں بچپن میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ۔ ان سب کے حالات آگے آئیں گے۔ حضرت خدیجہؓ کی ایک بہن ہالہ تھیں وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت خدیجہؓ سے آنحضرت ﷺ کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقدِ نکاح میں آئیں تو ان کی عمر چالیس (40) برس تھی اور آنحضرت ﷺ پچیس (25) سال کے تھے، نکاح کے بعد وہ پچیس (25) برس تک زندہ رہیں ان کی زندگی تک آنحضرت ﷺ نے دوسری شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ کی ہم نشین عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجھ کو جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ ہمیشہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس پر آپ ﷺ کو رنجیدہ کیا، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو ان کی محبت دی ہے۔ (صحیح مسلم فضائل خدیجہؓ)

ایک دفعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت ﷺ سے ملنے آئیں اور استیذان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی، آپ ﷺ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت خدیجہؓ یاد آ گئیں اور آپ ﷺ بے جھجک اٹھے اور فرمایا کہ "ہالہ ہوں گی" حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں ان کو رشک ہوا، بولیں کہ آپ ﷺ ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو مر چکیں اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں دیں، صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے۔ لیکن استیعاب میں ہے کہ جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انہوں نے میری مدد کی۔

☆☆☆☆☆

حضرت سودہؓ بنت زمعہ

ازواج مطہراتؓ میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں، وہ ابتدائے نبوت میں مشرف باسلام ہو چکی تھیں، اس بناء پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، ان کی شادی پہلے سکرانؓ بن عمرو سے ہوئی تھی، حضرت سودہؓ انہی کے ساتھ اسلام لائیں اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرت ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ کو واپس آئیں، سکران نے کچھ دن کے بعد وفات پائی اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا جس کا نام عبدالرحمٰن تھا، انہوں نے جنگ جلولاء میں شہادت حاصل کی۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال سے آنحضرت ﷺ نہایت پریشان و غمگین تھے، یہ حالت دیکھ کر خولہ بنت حکیم نے عرض کی کہ آپ ﷺ کو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! گھر بار بال بچوں کا انتظام سب خدیجہؓ کے متعلق تھا، آپ ﷺ کے ایماء سے وہ حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا، انعم صباحاً پھر نکاح کا پیغام سنایا، انہوں نے کہا ہاں محمد ﷺ شریف کفو ہیں لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو، غرض سب مراتب طے ہو گئے تو آنحضرت ﷺ خود تشریف لے گئے اور سودہؓ کے والد نے نکاح پڑھایا، چار سو درہم مہر قرار پایا۔ نکاح کے بعد عبداللہ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی) جو اس وقت کافر تھے آئے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہو گیا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت پر ہمیشہ ان کو افسوس آتا تھا، حضرت عائشہؓ اور سودہؓ کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا، اس لیے مورخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہؓ کو تقدم ہے، عبداللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں۔

شکل وشباہت

حضرت سودہؓ بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اسی بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ ان کو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہوگی۔

آیت حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طرز پر ازواج مطہراتؓ قضائے حاجت کے لیے صحرا کو جایا کرتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کو یہ ناگوار ہوتا تھا، اس بنا پر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے، لیکن ابھی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہؓ رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے نکلیں، چونکہ ان کا قد نمایاں تھا، حضرت عمرؓ نے کہا، سودہؓ! تم کو ہم نے پہچان لیا، اسی واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔

اخلاق وعادات

آنحضرت ﷺ کے اخلاق وعادات میں سخاوت وفیاضی ایک نمایاں وصف تھا، اس بناء پر صحابہؓ میں جس کو آپ ﷺ سے جس قدر تقرب حاصل تھا اسی قدر اس پر اس وصف خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا۔ ازواج مطہرات کو آپ ﷺ کے اخلاق وعادات وفیض صحبت سے متمتع ہونے کا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا، اس لیے یہ وصف ان میں عموماً نظر آتا تھا، حضرت سودہؓ اس وصف میں بہ استثنائے حضرت عائشہ ﷺ سب سے ممتاز تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولا درہم، بولیں کھجور کی تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں، یہ کہہ کر اسی وقت سب کو تقسیم کر دیا، اطاعت اور فرمانبرداری بھی ان کا خاص وصف ہے اور اس وصف میں وہ تمام ازواج مطہرات سے ممتاز تھیں۔

روایت حدیث

ان کے ذریعہ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے بخاری میں

صرف ایک ہے، صحابہؓ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن اسعد زرارہؓ نے ان سے روایت کی ہے۔

وفات

حضرت سودہؓ کے سال وفات میں اختلاف ہے، واقدی کے نزدیک انہوں نے امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت میں 54ھ میں وفات پائی، حافظ ابن حجر ان کا سال وفات 55ھ قرار دیتے ہیں، امام بخاری نے تاریخ میں بسند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا، ذہبی نے تاریخ کبیر میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی۔ حضرت عمرؓ نے 23ھ میں وفات پائی ہے اس لیے ان کا زمانہ وفات 22ھ ہوگا، خمیس میں ہے کہ یہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔

☆☆☆☆☆

حضرت عائشہؓ

عائشہؓ نام تھا، اگرچہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، تاہم اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ کے تعلق سے ام عبداللہ کنیت کرتی تھیں، ماں کا نام زینب اور اُمِ رومان کنیت تھی، بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں، 10 سال نبوی میں آنحضرت کے ساتھ نکاح ہوا، اس وقت چھ سالہ تھیں، آنحضرت ﷺ سے پہلے جبیر بن مطعم کے صاحبزادے سے منسوب تھیں، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آنحضرت سے ﷺ نکاح کی تحریک کی۔ آپ ﷺ نے رضا مندی ظاہر کی۔ خولہ نے اُمِ رومان سے کہا۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے مذکور کیا، بولے کہ جبیر بن مطعم سے وعدہ کر چکا ہوں، اور میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی، لیکن مطعم نے خود اس بنا پر انکار کر دیا کہ اگر حضرت عائشہؓ ان کے گھر آ گئیں تو گھر میں اسلام کا قدم آ جائے گا، بہر حال حضرت ابوبکرؓ نے خولہ کے ذریعہ سے آنحضرت ﷺ سے عقد کر دیا، چار سو درہم مہر قرار پایا لیکن مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ازواج مطہراتؓ کا مہر پانچ سو درہم ہوتا تھا۔

نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت ﷺ کا قیام تین سال تک رہا، 13ھ میں آپ ﷺ نے ہجرت کی تو حضرت ابوبکرؓ ساتھ تھے، اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے، جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اریقطؓ کو بھیجا کہ ام رومانؓ، اسماءؓ اور عائشہؓ کو لے آئیں۔ آنحضرت ﷺ نے بھی زید بن حارثہؓ اور ابو رافع کو حضرت فاطمہؓ، ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ وغیرہ کے لانے کے لیے روانہ فرمایا، مدینہ میں آ کر حضرت عائشہؓ سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، مرض کی شدت سے سر کے بال تک جھڑ گئے، صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا، اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر 9 سال کی تھی، سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں کہ ام رومان نے حضرت عائشہؓ کو آواز دی، ان کو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انہوں نے منہ دھویا، بال درست کیے، گھر

میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہوگئیں تو سب نے مبارک باد دی، چاشت کے وقت آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور رسم عروسی ادا ہوئی، شوال میں نکاح ہوا تھا اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی، زمانہ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا، اس بنا پر اہل عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لیے مکروہ خیال کرتے تھے، اس خیال کے مٹانے کے لیے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا۔

وفات

حضرت عائشہؓ نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ نو برس تک زندگی بسر کی، نو سال کی عمر میں وہ آپ ﷺ کے پاس آئیں اور جب آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا تو ان کی عمر 18 سال کی تھی، آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت عائشہؓ تقریباً 48 سال تک زندہ رہیں، 57ھ میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر 66 سال کی تھی، وصیت کے مطابق جنت البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں، قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمٰن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے قبر میں اتارا، اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اس لیے انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آنحضرت ﷺ کو حضرت عائشہؓ سے بہت محبت تھی، اسی محبت سے آپ ﷺ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بسر کیے۔ اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا، ان کے متعلق احادیث وسیرت میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں۔

علمی زندگی

حضرت عائشہؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے حضرت ابوبکر، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتویٰ دیتی تھیں، اکابر صحابہؓ پر انہوں نے دقیق اعتراضات کیے ہیں جن کو علامہ سیوطیؒ نے ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ ان سے 2210 حدیثیں مروی ہیں جن میں 174 حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، بخاری نے منفرداً ان سے 54 حدیثیں روایت کی ہیں۔ 68 حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے

کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے۔ ترمذی میں ہے کہ صحابہؓ کے سامنے جب کوئی مشکل سوال آجاتا تھا تو اس کو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں۔ ان کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب وانساب میں ان کو کمال تھا، شعراء کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبان یاد تھے، حاکم نے مستدرک میں اور ابن سعد نے طبقات میں بہ تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ ان کے فضل وکمال کے دلائل وشواہد ملتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں، ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا، بعثت سے پانچ برس پہلے عین اس سال جب قریش خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں، ان کی شادی خنیسؓ بن حذافہ سے ہوئی اور انہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی، خنیسؓ نے غزوۂ بدر میں زخم کھائے اور واپس آ کر انہی زخموں کی وجہ سے شہادت پائی۔ خنیسؓ نے اپنی یادگار میں حضرت حفصہؓ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی، سوءِ اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہؓ کا انتقال ہو چکا تھا اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمانؓ سے کی۔ انہوں نے کہا میں اس معاملہ میں غور کروں گا، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ذکر کیا، انہوں نے خاموشی اختیار کی، حضرت عمرؓ کو ان کی بے التفاتی سے رنج ہوا، اس کے بعد خود جناب رسالت پناہ ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کی خواہش کی۔ نکاح ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ سے ملے اور کہا کہ جب تم نے مجھ

سے حفصہؓ کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تم کو ناگوار گزرا لیکن میں نے اسی بنا پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا ذکر کیا تھا اور میں آپ ﷺ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر رسول اللہ ﷺ نے ان سے نکاح نہ کر لیا ہوتا تو میں اس کے لیے آمادہ تھا۔ حضرت حفصہؓ آخر حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں اس لیے مزاج میں ذرا تیزی تھی۔ صحیح بخاری میں واقعۂ ایلا کے متعلق خود حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے، میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا، اتفاق سے میری بی بی نے مجھ کو مشورہ دیا۔ میں نے کہا تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے؟ بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے، حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہیں، میں اٹھا اور حفصہؓ کے پاس آیا، میں نے کہا بیٹی! تم رسول اللہ ﷺ کو جواب دیتی ہو، یہاں تک کہ آپ ﷺ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں، بولیں ہاں ہم ایسا کرتے ہیں۔ میں نے کہا خبردار! میں تمہیں عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم اس کے گھمنڈ میں نہ آجانا جس کے حسن نے رسول اللہ ﷺ کو فریفتہ کر لیا ہے (یعنی عائشہؓ)۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا مجھ کو حفصہؓ نے کہا ہے کہ "تم یہودی کی بیٹی ہو" آپ ﷺ نے فرمایا، تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا پیغمبر ہے، اور پیغمبر کے نکاح میں ہو۔ حفصہؓ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے؟

ایک بار حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے حضرت صفیہؓ سے کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے نزدیک تم سے زیادہ معزز ہیں، ہم آپ ﷺ کی بیوی بھی ہیں اور چچا زاد بہن بھی۔ حضرت صفیہؓ کو ناگوار گزرا، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہو سکتی ہو، میرے شوہر محمد (ﷺ)! میرے باپ ہارونؑ اور میرے چچا موسیٰؑ ہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں جو تقرب نبویؐ میں دوش بدوش تھے۔ اس بناء پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دیگر ازواج کے مقابلہ میں باہم ایک تھیں، لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک و رقابت کا اظہار ہو جایا کرتا

تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آنحضرت ﷺ کے ساتھ سفر میں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے، ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہوں تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں۔ حضرت عائشہؓ راضی ہو گئیں، آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہؓ سوار تھیں جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جس میں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں، خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے۔

وفات

حضرت حفصہؓ نے 45ھ میں جو امیر معاویہؓ کی خلافت کا زمانہ تھا وفات پائی، وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبداللہ بن عمرؓ سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمرؓ نے ان کو کی تھیں، کچھ جائیداد بھی وقف کی اور کچھ مال صدقہ میں دیا، مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا، نماز جنازہ پڑھائی اور بنی حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا، یہاں سے قبر تک حضرت ابوہریرہؓ جنازہ کو لے گئے، ان کے بھائی عبداللہ عاصم، سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمرؓ کے لڑکوں نے قبر میں اتارا۔

☆☆☆☆☆

حضرت زینب اُمّ المساکینؓ

زینب نام تھا چونکہ فقراء و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں اس لیے اُمّ المساکینؓ کی کنیت کے ساتھ مشہور ہوگئیں۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے عبداللہؓ بن جحش کے نکاح میں تھیں، عبداللہ بن جحشؓ نے جنگ اُحد 3ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت ﷺ نے اسی سال ان سے نکاح کر لیا۔ نکاح کے بعد آنحضرت ﷺ کے پاس صرف دو تین مہینے رہنے پائی تھیں کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں جنہوں نے وفات پائی، آنحضرت ﷺ نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں، وفات کے وقت ان کی عمر 30 سال کی تھی۔

☆☆☆☆☆

حضرت اُمِ سلمہؓ

ہند نام، ام سلمہ کنیت تھی، باپ کا نام سہیل اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں جو زیادہ تر ابوسلمہ کے نام سے مشہور ہیں اور جو ان کے چچازاد اور رسول اللہ ﷺ کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور ان ہی کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ چنانچہ سلمہ ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا ہوئے، حبشہ سے مکہ میں آئیں اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی، ہجرت میں ان کو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہل سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کر کے مدینہ میں

آئیں، ان کے پہلے شوہر ابوسلمہؓ بڑے شاہسوار تھے، مشہور غزوات بدر و احد میں شریک ہوئے، غزوہ احد میں چند زخم کھائے جن کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے اور جمادی الثانی 4ھ میں وفات پائی، ان کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی، آنحضرت ﷺ نے 9 تکبیریں کہیں، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا، یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ ﷺ کو سہو تو نہیں ہوا، فرمایا یہ ہزار تکبیر کے مستحق تھے، ابوسلمہؓ کی وفات کے وقت ام سلمہؓ حاملہ تھیں۔ وضع حمل کے بعد جب عدت گزر گئی تو آنحضرت ﷺ نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انہوں نے چند عذر پیش کیے۔

(1) میں سخت غیور عورت ہوں۔

(2) صاحب عیال ہوں۔

(3) میرا سن زیادہ ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ان سب زحمتوں کو گوارا کیا۔

وفات

اہل سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواج مطہراتؓ میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی، لیکن ان کے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے، واقدی نے 59ھ بتایا ہے، ابراہیم حربی کے نزدیک 62ھ ہے اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ 58ھ میں وفات پائی، بعض روایتوں میں ہے کہ 61ھ میں جب امام حسینؓ کی شہادت کی خبر آئی اس وقت ان کا انتقال ہوا ہے، ابن عبداللہ نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔

اس اختلاف روایت کی حالت میں سال وفات کی تعین مشکل ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعہ حرہ تک زندہ تھیں، مسلم میں ہے کہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائے گا، یہ سوال اس وقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکر شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا واقعہ حرہ 63ھ میں پیش آیا ہے، اس لیے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں، ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وصیت کی بنا پر سعید بن زید نے نماز جنازہ پڑھائی، لیکن اس روایت کی

صحت میں کلام ہے، سعید بن زید نے باختلاف روایت 51ھ یا 52ھ یا 55ھ میں انتقال کیا ہے اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس وقت ام سلمہؓ زندہ تھیں، واقدی نے لکھا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے ان کا جنازہ پڑھایا مگر ان کی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابو ہریرہؓ خلاف وصیت کیونکر نماز جنازہ پڑھ سکتے تھے، بہر حال ازواج مطہرات میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی اور وفات کے وقت ان کی عمر 84 سال کی تھی۔

فضل وکمال

ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد فضل وکمال میں انہی کا درجہ ہے، ابن سعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے، روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہؓ کے سوا اور تمام بیبیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے، صلح حدیبیہ میں جب صحابہؓ کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا تو حضرت ام سلمہؓ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی اور ان کی یہ دانشمندی اور عقل وذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے۔ یہ واقعہ صحیح بخاری میں بہ تفصیل موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

حضرت زینبؓ

ازواج مطہرات میں جو بیبیاں حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینبؓ بھی تھیں، خود حضرت عائشہ کہتی ہیں، کانت تسامینی یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور ان کو اس کا حق بھی تھا۔ نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جمال میں بھی ممتاز تھیں، آنحضرت ﷺ کو بھی ان سے نہایت محبت تھی، زہد و تورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہؓ پر اتہام لگایا گیا اور اس اتہام میں خود حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ شریک تھیں تو آنحضرت ﷺ نے ان سے حضرت عائشہؓ کی اخلاقی

حالت دریافت کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

مَا عَلِمْتُ اِلَّا خَیْرًا.

(مجھ کو حضرت عائشہؓ کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں۔)

حضرت عائشہؓ کو ان کے اس صدق و اقرار حق کا خود اعتراف کرنا پڑا۔

عبادت میں نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت ﷺ نے ان کو عقد میں لانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ مہاجرین پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے حضرت زینبؓ اس معاملہ میں کچھ بول اٹھیں، حضرت عمرؓ نے ڈانٹا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے درگزر کرو، یہ اوواہ ہیں (یعنی خاشع و متضرع ہیں) نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست و بازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کا سالانہ نفقہ بھیجا، انہوں نے اس پر ایک کپڑا ڈال دیا اور بزرہ بنت رافع کو حکم دیا کہ میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کر دو، بزرہ نے کہا آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے، انہوں نے کہا کہ کپڑے کے نیچے جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے، دیکھا تو پچاس درہم نکلے۔ جب تمام مال تقسیم ہو چکا تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

وفات

آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات سے فرمایا تھا۔

”تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔“

یہ استعارۃً فیاضی کی طرف اشارہ تھا لیکن ازواج مطہراتؓ اس کو حقیقت سمجھیں، چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں، حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشین گوئی کا مصداق ثابت ہوئیں اور ازواج مطہراتؓ میں سب سے پہلے انتقال کیا، کفن کا خود سامان کر لیا تھا اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک صدقہ کر دینا، چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی، حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد ازواج

مطہرات سے دریافت کیا کہ کون قبر میں داخل ہوگا؟ انہوں نے کہا وہ شخص جو ان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا چنانچہ اسامہؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اُتارا 20ھ میں انتقال کیا اور 53 برس کی عمر پائی، واقدی نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ سے جس وقت ان کا نکاح ہوا اس وقت 35 سال کی تھیں۔

☆☆☆☆☆

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہؓ حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں جو قبیلۂ بنی مصطلق کا سردار تھا، مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی جو غزوہ مریسیع میں قتل ہوا، اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، انہی لونڈیوں میں حضرت جویریہ بھی تھیں، جب مالِ غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن قیس بن شماسؓ انصاری کے حصہ میں آئیں۔

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام کچھ رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہیں، اس طریقہ کو فقہا کی اصطلاح میں کتابت کہتے ہیں، اسی اصول کے موافق حضرت جویریہؓ مکاتبہ بن گئیں، ان کو شرط کے موافق 9 اوقیہ سونا ادا کرنا تھا لیکن رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی، وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں اور کہا یا رسول اللہ (ﷺ)! میں مسلمان کلمہ گو عورت اور جویریہ حارث کی بیٹی ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے۔ مجھ پر جو مصیبتیں آئیں وہ آپ ﷺ سے مخفی نہیں، میں ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی اور 9 اوقیہ سونے پر ان سے عہد کتابت کیا، یہ رقم میرے امکان میں نہ تھی لیکن میں نے آپ ﷺ کے بھروسہ پر اس کو منظور کر لیا اور اب آپ ﷺ سے اس کا سوال کرنے کے لیے آئی ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں؟ انہوں نے کہا وہ کیا چیز

ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں یہ رقم ادا کر دیتا ہوں۔ اور تم سے نکاح کر لیتا ہوں، وہ راضی ہوگئیں، آپ ﷺ نے ثابت بن قیس کو بلایا، وہ بھی راضی ہو گئے، آپ ﷺ نے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ یہ چرچا پھیلا تو لوگوں نے قبیلہ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلام کو اس بنا پر آزاد کر دیا کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں سے رشتۂ مصاہرت قائم کر لیا، آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جویریہؓ کی برکت سے سینکڑوں گھرانے آزاد کر دیئے گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ سے خود حضرت جویریہؓ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور آپ ﷺ نے تمام قیدیوں کو اُن پر ہبہ کر دیا تھا۔

حضرت جویریہؓ نے 50ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں، اس وقت ان کا سن 65 برس کا تھا۔

☆☆☆☆☆

حضرت اُمِ حبیبہؓ

رملہ نام اور ام حبیبہ کنیت تھی، آنحضرت ﷺ کی بعثت سے 17 سال پہلے پیدا ہوئیں اور عبید اللہ بن جحش سے عقد ہو گیا، آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے تو دونوں مشرف باسلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کی، ایک روایت ہے کہ ان کی بیٹی حبیبہ جن کی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں، حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں، حبشہ میں جا کر عبید اللہ بن جحش نے عیسائیت قبول کر لی لیکن ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں، اختلاف مذہب کی بنا پر عبید اللہ ابن جحش نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی، اور اب وہ وقت آ گیا کہ ان کو اسلام اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین بننے کا شرف بھی حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے عمر

بن امیہ الضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا، جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہؓ کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعہ سے پیغام دیا کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو تمہارے نکاح کے لیے لکھا ہے، انہوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر کیا اور اس مژدہ کے صلہ میں ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں، جب شام ہوئی تو نجاشی نے جعفر بن ابی طالب اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کر کے خود نکاح پڑھایا اور آنحضرت ﷺ کی طرف سے چار سو مہر ادا کیا۔

تمام لوگوں کے سامنے خالد بن سعید کو یہ رقم دی گئی، لوگوں نے بعد نکاح اٹھنا چاہا لیکن نجاشی نے کہا دعوت ولیمہ تمام پیغمبروں کی سنت ہے، ابھی بیٹھنا چاہیے، چنانچہ کھانا آیا، لوگ دعوت کھا کے رخصت ہوئے، جب مہر کی رقم ام حبیبہؓ کو ملی تو انہوں نے پچاس دینار ابرہہ کو دیے لیکن اس نے اس رقم کو اس کنگن کے ساتھ جو پہلے دیے گئے تھے، یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ بادشاہ نے مجھ کو منع کر دیا ہے، دوسرے دن ان کی خدمت میں عود، زعفران، عنبر وغیرہ لے کر آئی جن کو وہ اپنے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائیں، جب نکاح کے تمام رسومات ادا ہو گئے تو نجاشی نے ان کو شرحبیلؓ بن حسنہ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔

ام حبیبہؓ نے 44ھ میں وفات پائی اور مدینہ میں دفن ہوئیں۔

☆☆☆☆☆

حضرت میمونہؓ

میمونہ نام، باپ کا نام حارث اور ماں کا نام ہند تھا، پہلے مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی کے نکاح میں تھیں۔ مسعود نے طلاق دے دی تو ابورہم بن عبدالعزیٰ نے نکاح کر لیا، ابورہم کے انتقال کے بعد رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں، نکاح کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا، دوسری روایت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ سے اپنے غلام ابورافع کو اوس بن خولیٰ کے ساتھ وکیل بنا کر بھیجا اور انہوں نے ایجاب وقبول کیا، لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے اس نکاح کی تحریک کی اور انہی نے نکاح پڑھایا۔

وفات

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مقام سرف میں اُن کا نکاح ہوا تھا اور سرف ہی میں انہوں نے انتقال بھی کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا، صحاح میں ہے کہ جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا یہ رسول اللہ ﷺ کی بی بی ہیں، جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو، بہ ادب آہستہ لے چلو، سال وفات کے متعلق اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے 51ھ میں وفات پائی۔

☆☆☆☆☆

حضرت صفیہؓ

صفیہ اصل نام نہ تھا، زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہو جاتا تھا اس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ جنگ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت ﷺ کے نکاح میں آئی تھیں اس لیے صفیہ کے نام سے مشہور ہوگئیں ورنہ اصلی نام زینبؓ تھا، باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا، حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں کی جانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہ بنو النضیر کا سردار اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی، ابن مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا، حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی بھی کام آئے اور خود بھی گرفتار ہوئیں، جب خیبر کے تمام قیدی جمع کیے گئے تو دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت ﷺ سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے انتخاب کرنے کی اجازت دی، انہوں نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا، لیکن ایک صحابی نے آپ ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ آپ ﷺ نے رئیسہ بنونضیر وقریظہ کو دحیہؓ کو دے دیا، وہ تو صرف آپ ﷺ کے قابل ہے، آپ ﷺ نے حکم دیا کہ دحیہؓ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں، وہ صفیہؓ کو لے کر آئے تو آپ ﷺ نے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی اور صفیہؓ کو آزاد کر کے نکاح کر لیا۔ خیبر سے روانہ ہوئے تو مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا اس کو جمع کر کے دعوت ولیمہ فرمائی، وہاں سے روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواج مطہراتؓ میں داخل ہوگئیں۔

حضرت صفیہؓ کے ساتھ آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے۔ ایک بار آپ ﷺ سفر میں تھے، ازواج مطہراتؓ بھی ساتھ تھیں،

حضرت صفیہؓ کا اونٹ سوء اتفاق سے بیمار ہو گیا، حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہؓ کو دے دو، انہوں نے کہا کہ کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت ﷺ ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے، ایک بار آپ ﷺ حضرت صفیہؓ کے پاس تشریف لے گئے، دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں آپ ﷺ نے رونے کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا کہ عائشہؓ اور زینبؓ کہتی ہیں کہ ہم تمام ازواج میں افضل ہیں، ہم آپ ﷺ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپ ﷺ کی چچازاد بہن بھی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا، تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور محمد ﷺ میرے شوہر ہیں، اس لیے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو؟

حضرت صفیہؓ نے 50ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

☆☆☆☆☆

اولاد

آنحضرت ﷺ کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے۔ متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے چھ اولادیں تھیں، قاسمؓ، ابراہیمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ۔ ان تمام لڑکیوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور ہجرت سے شرف اندوز ہوئیں، لیکن ابن اسحاق نے دو صاحبزادوں کا نام اور لیا ہے، طاہر، طیب، اس بنا پر اولاد ذکور کی تعداد لڑکیوں کے برابر ہو جاتی ہے، اس بارہ میں تمام اقوال کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بارہ اولادیں تھیں جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، لڑکیوں کی تعداد میں کسی قسم کا اختلاف نہیں البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں بہت اختلاف ہے۔ مجموعی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے، جن میں قاسم اور ابراہیم پر تمام راویوں کا اتفاق ہے، حضرت ابراہیمؓ ماریہ قبطیہؓ سے اور بقیہ حضرت خدیجہؓ سے تھیں۔

☆☆☆☆☆

سیرت النبی ﷺ

جلد سوم (3)

(معجزات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دلائل و معجزات

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ (الاعراف آیت 101)
(اور ہمارے پیغمبر لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا۔)

روحانی نوامیس کا وجود

سیرت نبوی ﷺ کا یہ حصہ آنحضرت ﷺ کے اُن حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق اس عالم سے ہے جو ہمارے اس مادی عالم اور اس کے مادی قوانین کے حدود سے باہر ہے، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظامِ خاص پر چل رہی ہے، مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے۔

نبوت کے فطری و روحانی آثار

جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے اور آفتابِ ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغِ عالم میں جب برائیوں کی خزاں

چھا جاتی ہے تو موسم بدلتا ہے اور بہار نبوت[1] رونق افزا ہوتی ہے۔

اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کی رشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوت و رسالت کے خاص خاص اصول و قواعد ہیں جن میں تغیر راہ نہیں پاتا، انبیاء و رسل اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں، اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[1] خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے وجود باوجود سے پہلے انبیاء کا سلسلہ جاری رہا، حضور ﷺ کی آمد کے بعد جانشینان نبوت محمدی یعنی مجددین امت اس فرض کو انجام دیتے ہیں، یہ مجددین ملت رسول ﷺ کے متبع کامل ہوتے ہیں اور منصب نبوت سے عاری ہوتے ہیں، اسی لیے ان کے انکار سے کفر نہیں لازم آتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی موقت میں مختلف ملکوں میں یا ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں یا جماعتوں میں مختلف مجددین ملت ہوں، ان کی پہچان کا سب سے بڑا معیار عقائد و اعمال، اخلاق اور طرق دعوت میں رسول اکرم ﷺ کا اتباع کامل ہے، ان کا کام یہ ہے کہ وقت کے اوہام اور رسوم و اعمال کو جو باہر سے آ کر دین میں شامل ہو گئے ہوں دور کریں اور امور دین میں جو امور مٹ گئے ہوں ان کو دوبارہ جاری کریں۔

انبیاء کا اصلی معجزہ خود اُن کا سراپا وجود ہے

گو پیغمبر کا اصلی معجزہ اور اس کے منجاب اللہ ہونے کی کھلی نشانی خود اس کا سرتاپا وجود ہوتا ہے، دیکھنے والوں کے لیے اس کی چشم و ابرو میں اور سننے والوں کے لیے اس کے لب ولہجہ میں اور سمجھنے والوں کے لیے اس کے پیام و دعوت میں اعجاز ہوتا ہے لیکن جو لوگ احساسِ حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور محسوس نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں۔

انبیاء کے کامل پیرو اُن سے معجزہ نہیں مانگتے تھے

لیکن انبیاء کے متبعین میں سے سابقین اولین اور صدیقین و صالحین نے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا، حضرت موسیٰ کے ساتھیوں نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر نہیں تسلیم کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا تھا، حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے آنحضرت ﷺ پر ایمان لائیں، مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر نہیں بلکہ یہ جان کر کہ آپ ﷺ غریبوں کے دست و بازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں،[1] حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ اور دیگر اصحاب کبار رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی آپ ﷺ کی صداقت اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا، ان کے لیے آپ ﷺ کا سرتاپا وجود، نفس دعوتِ حق اور پیام اخلاص ہی معجزہ تھا، انہوں نے

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی

اسی کو دیکھا اور اسی سے ایمان کی دولت پائی۔

معاندین معجزوں کے بعد بھی ایمان نہیں لائے

مگر نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب جو آتش خلیل، طوفانِ نیل، قحطِ مکہ اور انشقاقِ قمر کے معجزوں کے طالب تھے پھر بھی ایمان کی دولت عظمیٰ سے محروم رہے، لیکن بایں ہمہ ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے، جس کی بصیرت کے آئینہ پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ چھائیاں پڑی ہوتی ہیں، جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (طٰہٰ) پکارا اٹھتے ہیں۔

معجزوں سے کن کو فائدہ پہنچتا ہے؟

فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا تو موسیٰؑ و ہارونؑ کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے، آنحضرت ﷺ کی فتح روم کی پیشین گوئی پوری ہوئی تو قریش کے نیک طبع لوگوں کی چشم باطن کھل گئی اور حقیقت کا پیکر ان کے سامنے جلوہ نما ہوگیا،[1] یہی طبقہ ہے جس کو معجزات کی ظاہری نشانیوں سے بقدر استعداد حصہ پہنچتا ہے، اس کے علاوہ معجزات کا بڑا حصہ مویدات یعنی تائید حق کے لیے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہونا ہے، مومنین صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعہ سے تسکین دی جاتی ہے اور رسوخ ایمان اور ثبات قدم مرحمت ہوتا ہے ان کی بے سروسامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات کی جاتی ہے اور اس سے ان کی دولت ایمانی کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ روم

ان واقعات کا اصطلاحی نام

حضرات انبیائے کرامؑ سے جو یہ مافوق العادۃ کیفیات اور اعمال صادر ہوتے ہیں، ان کے لیے عام طور پر معجزہ کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن یہ اصطلاح کئی حیثیتوں سے غلط ہے، اول تو اس لیے کہ قرآن مجید اور احادیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی جگہ آیت (نشانی) اور برہان (دلیل) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔[1] قدیم محدثین نے ان کی جگہ دلائل و علامات کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو الفاظ قرآنی کے ہم معنی ہیں، دوسرے یہ کہ عام استعمال کی بنا پر معجزہ کے ساتھ کچھ خاص لوازمِ ذہنی پیدا ہو گئے ہیں جو حقیقت میں صحیح نہیں ہیں، مثلاً اس لفظ سے عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے جس کا صدور خاص اس کے اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے اور نیز یہ کہ اس لفظ کے سبب سے اس کا معجزہ ہونا گویا اس کی حقیقت میں داخل ہو گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں خیال غلط ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معجزہ پر عقلی حیثیت سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ خود لفظ معجزہ کے غلط استعمال سے پیدا ہو گیا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو ایک ایسا جامع لفظ درکار ہے جس میں نبوت کے تمام خواص کیفیات، مشاہدات اور اعمال خارقۂ عادت اور غیر خارقہ عادت سب داخل ہیں، لیکن معجزہ کا لفظ اتنا وسیع نہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر صحیح طریقہ یوں ہے کہ ہم اس کتاب میں صرف قرآن کی اصطلاح آیت، برہان اور محدثین کی اصطلاح

[1] جیسے دلائل النبوت لابی نعیم اصبہانی متوفی 430ھ اور اعلام النبوت علامۃ الماوردی متوفی 450ھ

علامات و دلائل کو اختیار کریں تاکہ ہمارا مفہوم زیادہ صحیح طریقہ سے اور زیادہ وسیع طور سے ادا ہو سکے، لیکن چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل گیا ہے اس لیے اس کو یک قلم ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆☆☆

دلائل و براہین و آیات کا تعلق انبیاء کی سیرتوں سے

قرآن مجید اور دیگر صحف آسمانی میں انبیائے سابقین علیہم السلام کے جو قصص اور واقعات مذکور ہیں ان میں ان کے روحانی حالات و کیفیات یعنی دلائل و براہین اور آیات کا ذکر نہایت مؤثر اور عبرت انگیز طریقہ سے کیا گیا ہے۔ سیر ملکوت، مکالمۂ الٰہی، رویت ملائکہ، رویائے صادقہ، استجابت دعا، طوفانِ نوح، آتش خلیلؑ، عصائے موسیٰؑ، نفس عیسیٰؑ اور اس قسم کے اور بھی بہت سے کیفیات وحالات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور ان کے ساتھ ان کے عواقب و نتائج بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اس ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے ہر زمانہ میں ان چیزوں کو خاص تعلق رہا ہے اور اس وجہ سے وہ ان کے واقعاتِ زندگی کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی زندگی اگرچہ گونا گوں واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن نتائج کے لحاظ سے ان تمام واقعات کا مرکز صرف یہ ہوتا ہے کہ اس خاکدان کو اخلاق ذمیمہ کے خس و خاشاک سے پاک کر کے محاسن اخلاق کے گل و ریحان سے آراستہ کیا جائے تا کہ برکاتِ آسمانی کا دامن کانٹوں سے الجھنے نہ پائے، اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کو مادی آلات سے بھی کام لینا پڑتا ہے لیکن وہ لوگ اکثر اپنی روحانی طاقت سے اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور مادی آلات کے استعمال میں بھی ان کے جسمانی دست و بازو سے زیادہ ان کے روحانی دست وبازو کام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے اور ان کے ذکر سے گویا انبیاء علیہم السلام کے تمام حالاتِ زندگی کو سلسلۂ علل و اسباب سے مربوط کر دیا ہے۔

دلائل و آیات کا تعلق سیرتِ محمدیؐ سے

آنحضرت ﷺ کی سیرت تمام انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی کا خلاصہ، ان کی تعلیمات کا عطر اور ان کے حالات و مشاہدات کا برزخ ہے، آپ ﷺ ایک عالمگیری اور ابدی مذہب لے کر مبعوث ہوئے تھے، اس لیے آپ ﷺ نے ایک ہی خطاب کے ساتھ ان تمام لوگوں کو مخاطب فرمایا جن کو طوفانِ نوحؑ دفعۃً بہا لے گیا تھا، جن کو دریائے قلزم کی نہریں نگل چکی تھیں، جن کو نفس عیسیٰ نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا اور ان سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کا مخاطب ایک گروہ اور بھی تھا جو ان چیزوں کو صرف عجائب پرستی کی نگاہ سے نہیں بلکہ ژرف نگاہی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس بنا پر جس چشمۂ فیض نے اسباطِ موسیٰ" کو سیراب کیا تھا وہ ان تشنہ کا مانِ روحانیت سے کیونکر بے پروا ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے آنحضرت ﷺ کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا جو اعلیٰ قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لیے ضروری تھے، آپ ﷺ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے۔ آپ ﷺ کی شریعت معجزہ تھی، آپ ﷺ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے علاوہ آپؐ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا۔ اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ ﷺ کے لیے بستر لگایا۔ کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی، کبھی مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا اور کبھی مَا زَاغَ الْبَصَرُ کے سرمہ سے آپ ﷺ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزولِ رحمت الٰہی کے لیے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادیٔ حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہہ سے پانی کے چشمے نکالے، کبھی سنگ خارا کے

شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبانِ الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے، اور آئندہ دنیا کے واقعاتِ غیب بتا کر رہروانِ عالم کو منزلِ حقیقت کے نشان دکھائے۔

آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی کا سب سے بڑا جزو غزوات و محاربات ہیں اور ان ہنگامہ خیز واقعات کے تاریخی علل و اسباب اور اُن کے نتائج کا ذکر کتاب کے ایک حصہ میں بتصریح گزر چکا ہے لیکن جہاد کے میدان میں آپ ﷺ کو جو فتوحاتِ عظیم حاصل ہوئیں ان میں انسانوں کے لشکر اور سپاہیوں کے تیغ و خنجر سے زیادہ فرشتوں کے پرے، دعاؤں کے تیر، توکل علی اللہ کے سپر، اعتماد علی الحق کی تلوار کام کرتی نظر آتی تھی، آپ کی زندگی کا سب سے بڑا فرض اسلام کی اشاعت ہے اور روئے انور نے، نگاہِ کیمیا اثر نے، تقریرِ دلپذیر نے، اخلاقِ اعجاز نما نے آیات و دلائل بن کر بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ غرض آپ ﷺ کی پیغمبرانہ زندگی کے ہر مظہر میں یہ دلائل، یہ براہین، یہ آیات، یہ معجزات، اسبابِ ظاہری کے پہلو بہ پہلو اسبابِ حقیقی بن کر رونما ہوتے رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

آیات و دلائل کی دو قسمیں، ظاہری اور باطنی

آیات اور نشانات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادی آیات و دلائل تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں۔ مثلاً مردہ کا زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ اُبلنا، بیمار کو اچھا کرنا وغیرہ۔ باطنی اور روحانی آیات و دلائل مدعی نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم، ہدایت، ارشاد، فلاح اور تائید ہے۔ اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی باطنی آثار و آیاتِ نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری ہی آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

1- معجزۂ قرآن

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ. (بنی اسرائیل آیت 88)

آنحضرت ﷺ کو پیش گاہِ الٰہی سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن مجید ہے۔ چنانچہ جب کفار نے معجزہ طلب کیا تو خدا نے فرمایا۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ. (عنکبوت 51)

(اور انہوں نے کہا کہ پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں کیوں نہ اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کی قدرت میں ہیں۔ میں تو صاف صاف خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے اس پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔)

قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزۂ کامل ہے، اس کے معجزہ کامل ہونے پر مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزرے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک اُمی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے، تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے، کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک

ایک سال گزر گیا، مگر ایک آواز بھی اس تحدی کو قبول کرنے کے لیے بلند نہ ہوئی، اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیار اعجاز قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اس وقت جب ایک اُمی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا، یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا، اس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان آور شعراء اور آتش بیان خطباء موجود تھے مگر اس ''صوت سرمدی'' کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں، کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں، انہوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین وکیش کو برباد کیا، اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں، ان کے سپاہیوں نے میدانِ جنگ میں پرے جمائے، ان کے دولت مندوں نے اپنے خزانے کھول دیئے۔ ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستان عرب کو تنور بنا دیا، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورہ کا جواب پیش کریں جو اسلام کے دعوائے حق و صداقت کے کنگرہ کو چشم زدن میں پست کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے اور جب وہ زبان کے اصل مالک اور محاورہ عرب کے طبعی ماہر تھے اس کے مقابلہ سے عاجز تھے تو اس زمانے کے بعد کے لوگوں کے لیے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے۔

☆☆☆☆☆

2۔ شق قمر

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (القمر آیت 1)

پیغمبر کی صداقت کی گواہی کائنات کا ذرہ ذرہ دیتا ہے، آسمان اور زمین، چاند اور سورج ہر چیز اس کی صداقت کا ثبوت بن جاتی ہے، انجیل (متی 2-2) میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے وقت ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور جب انہوں نے وفات پائی تو تین گھنٹہ کے لیے تمام دنیا میں اندھیرا چھا گیا (متی 45:27) قرب قیامت کی ایک نشانی یہ بھی تھی کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے، یہ نشانی آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر پوری اتری اور قرآن نے کہا۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ. (القمر آیت 1۔2)

(قیامت نزدیک آ گئی اور چاند شق ہو گیا، اگر کافر کوئی بھی نشان دیکھیں تو اس سے اعراض ہی کریں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو سدا سے ہوتا آیا ہے۔)

بعض عقل پرست مسلمانوں نے قرب قیامت کی مناسبت سے یہ تاویل کی ہے کہ اس آیت سے آنحضرت ﷺ کے عہد میں شق قمر کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ یہ قیامت کے واقعہ کا ذکر ہے، لیکن اس حالت میں اول، تو بے قرینہ ماضی (چاند پھٹ گیا) کو مستقبل (چاند پھٹ جائے گا) کے معنی میں لینا پڑے گا، دوسرے یہ کہ اگر قیامت کا واقعہ ہوتا تو اس کے بعد یہ کیوں ہوتا کہ "یہ کافر اگر کوئی سی نشانی بھی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور یہ کہیں

کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے۔" قیامت سامنے آجانے کے بعد اس کے انکار کے کیا معنی اور اس کو مستمر جادو کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟ اس کے علاوہ مستند اور صحیح روایات کی کیونکر تردید کی جاسکتی ہے۔

اس شق قمر کا واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند ابن حنبل، مسند طیالسی، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی اور دلائل ابونعیم میں بہ تصریح تمام مذکور ہے کہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جبیرؓ بن مطعم، علیؓ بن ابی طالب اور حذیفہؓ بن یمان وغیرہ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے ان میں سب سے صحیح اور مستند تر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے جو صحیح بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں مروی ہے، وہ اس واقعہ کے وقت موقع پر موجود تھے اور اس معجزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

انشق القمر ونحن مع النبی ﷺ بمنیٰ فقال اشهدوا وذهبت فرقة نحو الجبل (بخاری وترمذی ومسلم)

(ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا آپ نے فرمایا گواہ رہو۔)

صحیحین میں ان کی دوسری روایت یہ ہے۔

انشق القمر علی عهد رسول الله ﷺ فرقتین فرقة فوق الجبل و فرقة دونه فقال رسول الله ﷺ اشهدوا.

(صحیح بخاری ومسلم)

(آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا تو پہاڑ کے اوپر رہا اور دوسرا اس کے نیچے آپ ﷺ نے فرمایا گواہ رہو۔)

حضرت انسؓ بن مالک کی یہ روایت بخاری ومسلم دونوں میں ہے۔

ان اهل مكة سالوارسول الله ﷺ أن يريهم آية فاراهم القمر شقتين حتى رأو حراء بينهما.

(اہل مکہ نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ ان کو کوئی معجزہ دکھائیں، آپ نے ان کو چاند کے ٹکڑے دکھائے، ایک ٹکڑا حرا کے اس طرف تھا دوسرا اس طرف۔)

صحیح مسلم میں ہے۔

ان اهل مكة سالوا النبی ﷺ ان يريهم اية فاراهم انشقاق القمر فرقتين.

(اہل مکہ نے آنحضرت ﷺ سے کوئی نشانی طلب کی تو آپ ﷺ نے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کو دکھایا۔)

جامع ترمذی میں ان کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

سال اهل مكة النبی ﷺ اية فانشق القمر بمكة فرقتين فنزلت.

(اہل مکہ نے آنحضرت ﷺ سے کوئی نشانی طلب کی تو چاند مکہ میں دو ٹکڑے ہو گیا اس پر یہ آیت اتری۔)

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. (القمر آیت 1)

(قیامت آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔)

جامع ترمذی اور مسند ابن حنبل میں جبیرؓ بن مطعم کی جو روایت ہے اس میں ہے کہ اس معجزہ کو دیکھ کر کفار نے کہا کہ محمد ﷺ نے ہم پر جادو کر دیا ہے، دوسروں نے کہا کہ اگر ہم پر جادو کر دیا ہے تو تمام آدمیوں پر تو جادو نہیں کر سکتے، مسند ابوداؤد طیالسی اور بیہقی میں ہے کہ انہوں نے کہا محمد ﷺ تمام دنیا پر تو جادو نہیں کر سکتے۔ مسافروں کو اور مقامات سے آنے دو، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں؟ چنانچہ جب اِدھر اُدھر سے مسافر آئے اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا۔

بہر حال یہ معجزہ رات کے وقت مکہ میں بمقام منیٰ واقع ہوا۔

شق القمر اہل مکہ کی طلب پر ایک آیت الٰہی تھی، یعنی ان منکروں کو اُن کی

خواہش کے مطابق ثبوت کی ایک نشانی دکھائی گئی تھی، احادیث میں یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، خواہ دراصل چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں یا خدا نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا ہو کہ ان کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، جو خدا انسانوں کی آنکھوں میں خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے وہ خود چاند میں بھی خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے، پھر چونکہ اللہ نے یہ نشانی اہل مکہ کے لیے ظاہر کی تھی اور ان ہی کے لیے یہ آیۂ ثبوت تھی، اس لیے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور روایت کی حاجت نہ تھی، اس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شق قمر مشاہدہ نہ ہوا تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں، بلکہ اہل مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاع عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ آسمان کے طبعی انقلابات میں سے کوئی انقلاب تھا، جیسا کہ اور سینکڑوں قسم کے تغیرات اس سے پہلے ہو چکے ہیں، جیسا کہ فلکیات اور علم بدء الخلق (کسموگریفی اور نیچر ہسٹری) میں مذکور ہیں، لیکن جب اہل مکہ کے علاوہ جو شہر میں تھے یا باہر قافلہ میں تھے صرف ان ہی کو نظر آیا تو اس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت ﷺ کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا۔ وللہ الحمد۔

☆☆☆☆☆

3- پتھروں سے سلام کی آواز

آنحضرت ﷺ نبوت کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ میں مکہ کے اُس پتھر کو پہچانتا ہوں جو مجھ کو نبوت سے پہلے سلام کیا کرتا تھا۔ میں اب بھی اس کو پہچانتا ہوں۔ یہ صحیح مسلم، مسند احمد اور دارمی کی روایت ہے۔ دوسری روایتوں[1] میں ہے کہ میں مکہ کے اُس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری بعثت کے زمانہ میں مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔

4- ستون کا رونا

مسجد نبوی میں پہلے منبر نہ تھا۔ مسجد میں خرمے (کھجور) کے تنے کا ایک ستون تھا۔ آپ ﷺ اس سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے، منبر تیار ہوا تو آپ ﷺ نے اس پر کھڑے ہو کر جمعہ کا خطبہ دینا شروع کیا تو دفعتاً اس ستون سے بچوں کی طرح رونے کی آواز آنے لگی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اُونٹنیوں کی طرح بلبلانے کی آواز آئی۔ یہ حاضرین کے اختلاف مذاق کی بنا پر رونے کی مختلف تشبیہیں ہیں۔ راویوں کا مشترک مقصود یہ ہے کہ دردِ فراق سے اس سے جزع فزع کی آواز سنائی دینے لگی۔ یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ منبر سے اُتر کر آئے اور ستون پر تسکین کے لیے ہاتھ پھیرا اور اس کو سینہ سے لگایا تو آواز بند ہوگئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا رونا اس بنا پر تھا کہ یہ پہلے خدا کا ذکر سنا کرتا تھا۔[2]

---

[1] جامع ترمذی

[2] صحیح بخاری باب علامات النبوت

یہ واقعہ حدیث کی اور سیرت کی کتابوں میں گیارہ (11) مختلف صحابیوں سے منقول ہے۔[1]

5- جانور کا آپ ﷺ کے مرتبے کو پہچاننا

ایک دفعہ آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں گئے۔ ایک اُونٹ کھڑا چلا رہا تھا۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر وہ بلبلانے لگا اور اس کی دونوں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ آپ ﷺ نے قریب جا کر اُس کے سر اور کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہو گیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کا اُونٹ ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام بتایا۔ وہ بلوائے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

> ”تم ان جانوروں پر جن کو خدا نے تمہارا محکوم بنایا ہے رحم کیا کرو۔ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس کو تکلیف دیتے ہو۔“[2]

☆☆☆☆☆

---

[1] جابر بن عبداللہؓ (صحیح بخاری، نسائی)

[2] ابوداؤد (کتاب الجہاد۔ باب الشفقت علی البہائم)

6- حضرت علیؓ کی آنکھوں کا اچھا ہونا

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سلمہ بن اکوعؓ اور حضرت سہیل بن سعدؓ تین چشم دید گواہوں سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر میں جب آپ ﷺ نے علم عطا فرمانے کے لیے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو طلب فرمایا تو معلوم ہوا کہ اُن کی آنکھوں میں آشوب چشم ہے اور یہ آشوب جیسا کہ مسند ابن حنبل میں ہے ایسا سخت تھا کہ ایک صاحب (سلمہ بن اکوعؓ) اُن کا ہاتھ پکڑ کر لائے تھے۔ آپ ﷺ نے اُن کی آنکھوں میں اپنا لُعابِ دہن دیا اور دَم کر دیا۔ وہ اُسی وقت اچھی ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی آنکھوں میں کبھی درد تھا ہی نہیں [1]

7- حضرت عمرؓ کا اسلام لانا

ایک طرف قریش کے سربرآوردہ اصحاب، اسلام اور داعی اسلام کی عداوت اور دشمنی کی کوششوں میں مصروف تھے، اور دوسری طرف داعی اسلام ان کی ہدایت و رہنمائی کے پُرمحبت ولولوں سے معمور تھا، ابوجہل و عمر کہ دونوں آنحضرت ﷺ کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت اور مستقل تھے، اُن ہی کی ہدایت کا پُرشوق ارمان آپ ﷺ کے قلب مبارک میں سب سے زیادہ تھا۔ جب تبلیغ و دعوت کے دوسرے حربے ان پر کامیاب نہ ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے اُن سب سے کارگر حربہ کو اُن کے مقابلہ میں استعمال کیا جس کے وار کی کوئی روک نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی کہ خداوندا! ابوجہل میں،

[1] صحیح بخاری، صحیح مسلم

عمر میں جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کو معزز کرے[1]

ابن ماجہ اور حاکم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا تھا۔ اس دعا کو ابھی چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمرؓ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

1 جامع ترمذی، مناقب عمر

8- سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں کا دھنس جانا

جب آپ ﷺ ہجرت کی غرض سے مدینہ کو روانہ ہوئے تو کفار کے جاسوسوں میں سراقہ نے آپ ﷺ کا پیچھا کیا اور آپ ﷺ سے اس قدر قریب آ گیا کہ حضرت ابوبکرؓ گھبرا گئے، بول اُٹھے کہ "ہم آ لیے گئے۔" آپ ﷺ نے اُن کی دل دہی کی اور دعا فرمائی جس کے اثر سے اُس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نے یہ حالت دیکھ کر کہا کہ تم دونوں نے مجھے بد دعا دی۔ اب دعا کرو تو میں تمام لوگوں کو تمہارے تعاقب سے واپس لے جاؤں۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے دعا فرمائی اور اس نے اس مصیبت سے نجات پائی۔ وہاں سے واپس آیا تو تمام تعاقب کرنے والوں کو واپس لے گیا۔[1]

9- ایک مغرور کا ہاتھ شل ہونا

آپ ﷺ کے سامنے ایک شخص نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ اس نے غرور سے کہا، میں اس سے نہیں کھا سکتا۔ چونکہ اُس نے غرور سے کہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، خدا کرے ایسا ہی ہو۔ چنانچہ اس کے بعد ایسا ہوا کہ وہ دائیں ہاتھ کو اُٹھا کر واقعی اپنے منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا۔[2]

☆☆☆☆☆

---

1. صحیح بخاری، باب علامات نبوت
2. صحیح مسلم، باب آداب الطعام

10- تھوڑے سے کھانے میں ستر (70) آدمیوں کا سیر ہونا

ایک دن حضرت ابوطلحہؓ نے آنحضرت ﷺ کی آواز سے محسوس کیا کہ آپ ﷺ بھوک کی شدت سے ضعیف (کمزور) ہو رہے ہیں۔ گھر آئے اور بی بی اُمِ سلیم سے کہا کہ مجھ کو آنحضرت ﷺ کی ضعیف آواز معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ بھوکے ہیں۔ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے۔ اُنہوں نے جو کی چند روٹیاں دوپٹے میں لپیٹ کر حضرت انسؓ کے ہاتھ آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجیں۔ وہ روٹیاں لے کر آئے تو آپ ﷺ صحابہؓ کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حضرت انسؓ سامنے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا ابوطلحہؓ نے تمہارے ہاتھ کھانا بھیجا ہے؟ اُنہوں نے کہا، ہاں۔ آنحضرت ﷺ تمام صحابہ کے ساتھ اُٹھے اور حضرت ابوطلحہؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت انسؓ نے ان کو خبر کی تو اُنہوں نے بی بی سے کہا کہ آنحضرت ﷺ ایک جماعت کے ساتھ تشریف لائے ہیں اور ہمارے پاس کھلانے کا کوئی سامان نہیں۔ آنحضرت ﷺ ابوطلحہؓ کے ساتھ آئے اور اُم سلیمؓ سے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو لاؤ۔ اُنہوں نے وہی روٹیاں پیش کیں جو حضرت انسؓ کے ہاتھ بھیجی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کے حکم سے اُن کو چورا کیا گیا اور اُم سلیمؓ نے گھی کا برتن اُنڈیل دیا جس نے سالن کا کام دیا۔ لیکن ان ہی روٹیوں میں یہ برکت ہوئی کہ آپ ﷺ دس دس آدمیوں کو بلا بلا کے کھلاتے تھے اور وہ شکم سیر ہو ہو کے جاتے تھے، یہاں تک کہ ستر اسی آدمی آسودہ ہو گئے[1]

---

[1] صحیح بخاری۔ باب علامات النبوۃ

11- مشکیزہ سے پانی اُبلنا

ایک دفعہ آپ ﷺ سفر میں تھے، صبح کو آنکھ کھلی اور آپ ﷺ نے نماز پڑھانی شروع کی تو ایک صحابی جماعت سے الگ ہو گئے۔ آپ ﷺ نے شریک جماعت نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو اُنہوں نے جنابت کا عذر کیا۔ چونکہ پانی نہ تھا، اس لیے ان کو آپ ﷺ نے تیمم کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے چند صحابہ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا۔ وہ لوگ چلے تو ایک عورت ملی جو اونٹ پر دو مشکیزوں میں پانی لاد کر لیے جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے اس چشمہ کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا: اس جگہ پانی نہیں ہے۔ پھر ان لوگوں نے دریافت کیا کہ تمہارے قبیلہ اور چشمہ کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے؟ اس نے ایک دن اور ایک رات کی مسافت بتائی۔ وہ لوگ اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے اور آنحضرت ﷺ نے ہاتھ سے مشکیزوں کو چھو دیا۔ آپ ﷺ کے دست مبارک کی برکت سے اس پانی کی مقدار میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ چالیس آدمیوں نے اس سے خوب سیراب ہو کر پانی پیا اور اور اپنے اپنے تمام مشکیزے اور برتن بھر لیے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کھجور اور روٹی کے ٹکڑے جمع کر کے اس عورت کو دیئے۔ وہ اپنے گھر آئی تو حیرت و استعجاب سے لبریز تھی۔ اُس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ میں نے سب سے بڑے ساحر کو یا اس کے معتقدین کے خیال میں ایک پیغمبر کو دیکھا، آخر اسی خاتون کے اثر سے پورا قبیلہ مع اس عورت کے مسلمان ہو گیا۔[1]

☆☆☆☆☆

---

[1] صحیح بخاری، باب علامات النبوت

12- حضرت فاطمہ زہراؓ کی وفات کی اطلاع

آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض الموت میں ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کو اپنے پاس بلایا اور اُن کے کان میں کوئی بات کہی کہ وہ رونے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن سے ایک اور بات کہی کہ وہ ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا اور ان سے اس کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا راز ظاہر نہیں کر سکتی۔ جب آپ ﷺ کی وفات ہو گئی تو حضرت عائشہؓ نے دوبارہ ان سے دریافت کیا۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا: ہاں اب میں بتا سکتی ہوں۔ حضورؐ نے پہلے مجھ سے یہ فرمایا کہ میں اسی بیماری میں انتقال کروں گا اور پھر فرمایا: اے فاطمہؓ میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم آ کر مجھ سے ملو گی۔[1]

یہ دونوں باتیں صحیح ثابت ہوئیں۔ آپ ﷺ نے اسی مرض میں وفات پائی اور آپ ﷺ کی وفات کے تقریباً چھ ہی مہینوں کے بعد حضرت فاطمہ زہراؓ بھی اس دنیا سے چل بسیں۔

13- حضرت عمارؓ شہید ہوں گے

آپ ﷺ نے غزوۂ خندق میں حضرت عمارؓ کے سر پر دست شفقت پھیر کر فرمایا۔ افسوس تجھ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔[2]

یہ پیشین گوئی متعدد صحابہ سے منقول ہے، حضرت عمارؓ، حضرت علیؓ کی معیت میں امیر معاویہؓ کے ساتھیوں کے ہاتھ سے جنگِ صفین میں شہید ہوئے۔

☆☆☆☆☆

---

1. صحیح مسلم باب الفضائل۔ صحیح بخاری باب علامات النبوت
2. دیکھو شرح مسلم

سیرت النبی ﷺ

جلد چہارم (4)

(عقائد)

”محمد رسول اللہ ﷺ جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے، وہ اِن ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق۔ ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لیے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ ﷺ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔“

☆☆☆☆☆

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا۔

الا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلّه و اذا فسدت فسد الجسد کلّه الا و هی القلب.

(صحیح بخاری کتاب الایمان)

(انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں وہ ٹکڑا دل ہے۔)

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِيْمٌ (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قَلْبٌ اٰثِمٌ (گنہگار دل) یہ وہ ہے[1] جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قَلْبٌ مُنِيْبٌ (رجوع ہونے والا دل)۔ یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیر نگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے۔ ہمارے تمام اعمال کا محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے۔ اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے اسی لیے آپ نے فرمایا۔

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری، آغاز کتاب)

(تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔)

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد، اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا۔ چند سیدھے سادے اصول جو تمام دینی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کیے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال، جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس جہان کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلۂ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا

[1] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بقرہ۔ 39)

غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے علاوہ خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لیے کریں اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں، ہمارے دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو، اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے، اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے۔ پھر اچھے اور برے صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہیں ہو گی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام وہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں، اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے، ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود

ہو جائے اور ہمارے سے نیکی اور بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو، اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے، اس لیے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے، بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روزِ جزا پر ایمان لانا، یہ عقائدِ خمسہ یکجا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اٰمَنَ بِاللّٰہِ

ایک قادر مطلق اور ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین، اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی ﷺ کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا، مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصاب درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف و حقائق جسمانی اور اعمال و اخلاق کا سر بنیاد قرار دیا، خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا۔

> اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ. (النساء آیت 116)
>
> یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔

پھر اسی کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسماء و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیم محمدی ﷺ کی امتیازی شان ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ نبوتِ محمدیہ ﷺ کی غرض و غایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ

ایک زندہ قوم، جدوجہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی و تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیے نمونہ عمل بنانا تھا، اس لیے سب سے پہلے اہل عرب کو جو اس کے مخاطب اول تھے رموز و اسرارِ توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لیے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

☆☆☆☆☆

اصلاحِ عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلۂ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پرزور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود (خدا) یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی سبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

توحید اور اس کے ایجابی اصول و ارکان

آنحضرت ﷺ نے ان تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا، یک قلم محو کر دیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں، اور ان کی جگہ مرتب، متیقن، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی، جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لیے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی، جو آخری زمانہ تک کے لیے اور تمام قوموں کے لیے تھی اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی، اور قدرت کے سربمہر خزانے وقف عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین،

ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے، جن میں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لیے ہوئی، اس لیے آپ ﷺ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا۔ بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں مشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

☆☆☆☆☆

خدا کی حقیقی عظمت

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے، مگر قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے، یہودیوں کا خدا، ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی، اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا، وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادیں تھیں، عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا، ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی، ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لیے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج، چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان، سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح وتہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قدرت والا ہے۔ سب جاہل ہیں اس ایک کو علم ہے۔ سب فانی ہیں، اس ایک کو بقا ہے۔ سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں، وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری

ہے، وہ ہر قسم کے صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے۔ اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ و مثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناطے سے پاک ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ. (الزمر آیت 6)

وہ ہے اللہ تمہارا رب اس کی بادشاہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام، ان کے ہاں اللہ تھا، مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں، اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں، کن کن باتوں سے وہ پاک، اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیے، اس سے کیونکر مانگنا چاہیے، اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہیے یا ہم سب اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جا سکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے، اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے، اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدہ اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے، کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال

کے جواب دہ بھی ہیں، ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا، عرب جاہلیت کا ایک ایک ذرہ پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کر لو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور لطف و محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض، اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے منزہ و پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا، اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسیوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے

آسمان و زمین کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو پھر بنا دے، اس کی محبت دنیا کا اصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. (الرعد 28)

(ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔)

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا، وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران 191)

(وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔)

☆☆☆☆☆

فرشتوں پر ایمان

وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے اس کا واحد مَلک، مِلاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے۔ اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں، اس لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں۔ ان سے مراد وہ غیر مادی نیک مخلوق، ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں۔ اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں، یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القاء کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں، ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا ان کی خلقت اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے۔ دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیاء پر اپنے جو احکام اتارتا یا اُن سے کلام کرتا ہے وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب وعلل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے لوگ انہی ظاہری اسباب وعلل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے، کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے، جو اس پر حکمراں ہے، یہ لوگ اسی آگ کے فرمانروا کے سامنے جھکتے ہیں۔ اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العٰلمین اور فرمانروائے ارض وسما کے حکم کے تابع ہیں اور سب کو اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں، جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور وہ اسباب وعلل جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح الٰہیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے۔

ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں۔ اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کی رُو سے عقل اول کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا، اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کار فرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابئ اجرام سماوی کی شکل میں انکی پرستش کرتے تھے، اور انہیں کو عالم کا فرمانروا مانتے تھے، یہودی بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ (صحیفۂ تکوین 16 ,13- 18 ,2- 3 ,22) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے، اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے، اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا، عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے وہ ان کی پوجا کرتے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیم محمدیؐ نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا، اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت، عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے۔ وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں، اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے دونوں کی تردید کی، اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، وہ نہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَ هُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء آیت 26 تا 29)

(مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے۔ وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے، اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے۔ ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔)

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

1- ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی، کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

2- دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو ان مادی خواص و طبائع کی بالذات کار فرمائی کا یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے، کیونکہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے، درحقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط

ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات موثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ سے اُن کو موثر بناتا ہے۔ اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواحِ مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

رسولوں پر ایمان

وَ رُسُلِهٖ

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے، اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی۔ اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل ونینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ ہونے کا دعویٰ تھا، اور وہ صرف اپنے کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے، لیکن تعلیم محمدیؐ نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا، آپ ﷺ نے یہ دکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں، نہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے، ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں خدا کی مخلوق ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدمؑ) کی اولاد ہو، اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا، اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ وروپ، ملک ومرز بوم اور زبان سے نہیں، بلکہ تقویٰ اور نیکو کاری ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے، اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

بعثت محمدیؐ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی، ہندوستان کے رشیوں اور نبیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا، زروشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزدان کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا، بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے، عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں؛ اس کی نگاہ میں عرب و عجم، شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب، پچھم، اُتر، دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا، اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس: 47)

(اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔)

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلاً (النحل 36)

(اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔)

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے۔ دوسری روایت میں اس سے کم تعداد مروی ہے، قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے۔ یا اُن کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و

نصاریٰ بے خبر تھے۔ مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے۔ مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ۔ وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

قرآن نے یا آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لے لینے سے دلوں میں جوش عقیدت نہیں پیدا ہوسکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی، اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیاء کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیاء کا نام ونشان صحیفۂ محمدی ﷺ میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیاء کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی۔ فرمایا:

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا. رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. (النساء 163 تا 165)

(ہم نے (اے محمد ﷺ) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی اور ہم نے ابراہیمؑ کو اور اسمٰعیلؑ کو اور اسحاقؑ کو اور یعقوبؑ کو اور ہارونؑ کو اور سلیمانؑ کو وحی بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا، اور خدا نے موسیٰ سے بات کی، اور ان

رسولوں کو خوشخبری سنانیوالا اور ہشیار کرنیوالا بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں کو
رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے
اور خدا غالب و دانا ہے۔)

انبیاء کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِکَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْکَ. (المومن آیت 78)

(اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔)

تعلیم محمدیؐ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں، اور اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت وعظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بناء پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رام کو بلکہ ایران کے زردشت کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے، بہر حال امکان میں تو شک ہی نہیں، لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیاء کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے ہیں، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاء کے نام مذکور ہیں، تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیمبر آئے تھے، گو بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں، اگر ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں، تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینۂ غالب ہو سکتا

ہے، لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے، اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت و رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیاء اور رسولوں کی سیرتوں سے نا آشنا تھے، جو ان کے ادب و احترام اور تصدیق اور اعتراف سے بیگانہ تھے۔ جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ بن مریم پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی، اور جو حضرت موسیٰ کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے اور تبرکا ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے، اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں رائج ہیں، انہوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی، ان کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنا لیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود وسلام پڑھے۔

☆☆☆☆☆

کتب الٰہی پر اِیمان

وَ کُتُبِہٖ

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے، ہر چند یہ عقیدہ گذشتہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے، تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی، تا کہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ (البقرہ 4)

اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی۔

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود، ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں، جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہیں، قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام عبادات مذکور ہیں، ان سب کو

بے کم وکاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟ اسی بناء پر اس کی تشریح آنحضرت ﷺ نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی کہ "بِمَا جِئْتُ بِهٖ" (جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ) قرآن نے کہا:

وَ اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (محمد: 1)

(اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔)

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحب مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے، اور یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہل قرآن، قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفۂ محمدی ﷺ کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی منجانب اللہ تسلیم نہ کرے، نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے، توراۃ جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ" بھی کہا گیا ہے۔ (الاعلیٰ آیت 1) اور حضرت داؤدؑ کی زبور، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل اور خود قرآن، ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیمؑ کا بھی تذکرہ ہے:

اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ٥ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی. (الاعلیٰ 18-19)

(یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی۔)

اس بناء پر انبیاءؑ کی طرح ان کتابوں پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی اور اجمالی ایمان ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان پر ناموں کیساتھ، اور جن کے نام مذکور نہیں، ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے، لیکن اس کا تصریح سے نام قرآن میں مذکور نہیں ہے، اور اس میں توحید الٰہی کی

دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے تو اگرچہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے، اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب [1]، یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے، لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے، کہ صحیفۂ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے، اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتاب الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے۔ پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو جنت کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کرے، جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیے آیا ہے اس لیے ہر تحریف اور انسانی

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقرہ۔

تصرّف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے اور قیامت تک کی جائے گی۔ اس لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے۔ البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لیے ائمہ، خلفاء، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت نبویؐ کا احیاء اور بدعات کا قلع وقمع ہے۔

اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا، اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے بلوغِ کمال کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک محفوظ و باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے، اور جو اصل مقصد نہیں، ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے اور عہدِ محمدی ﷺ تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے۔ یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ آپ ﷺ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کے جواب میں یہی ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں، ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں۔ ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے۔ بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی، وہ ان کا قبلہ ہوئی۔ ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی دل بستگی اور لگاؤ تھا اس لیے یہ اُن کا قبلہ بنی۔ نبوت محمدی ﷺ کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے۔ بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب

سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں۔ یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے۔ چونکہ اُن کے پیرو اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے، اس لیے محمد رسول ﷺ اسی کو لے کر آخری دفعہ تشریف لائے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی، کبھی ناقص نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کا صحیفۂ ہدایت (قرآن) تحریف واختلافات اور تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

☆☆☆☆☆

تکمیلِ دین

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے، اور اس کے ذریعہ سے دین الٰہی اپنے تمام اصول وفروع (مناسک ومناہج وشرائع) کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی، خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:۔

> ''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا۔'' (استثناء 18-19)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا، جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی کہا:۔

> لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا۔ (یوحنا14-26)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا، اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا، جو اس کی تکمیل کرے گا۔ آخر وہ موعود الامم (ﷺ) آیا اور دعویٰ کیا کہ

میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں، اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں، جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آئی ہے، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں، جو اُوپر سے سنتا ہوں اور آخر زمانۂ نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلانِ عام کیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۝ (المائدہ آیت 3)

(آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کا دین پسند کیا۔)

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے لیے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے، یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے، بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے اس نے اپنے بعد کسی آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا، کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنیوالے، کسی نئے کلام اور کسی نئی خبر کا مصداق کہاں؟ اور اسی بناء پر قرآن نے ہر جگہ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (جو محمد ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وَمَآ اُنْزِلُ مِنْ بَعْدِكَ کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

☆☆☆☆☆

قرآن مہیمن کتب ہے

اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (المائدہ آیت 48)

(اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔)

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ. (المائدہ آیت 48)

(اور ہم نے (اے محمد ﷺ) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اس پر شاہد و حاوی ہے۔)

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے۔

ابن عباسؓ، شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہؓ، قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔

☆☆☆☆☆

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے۔ قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی، اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا، پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی، زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا، اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے۔ ان کی کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا، اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا، اس کی بقاء اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ. (الحجر آیت 9)

ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت مقدمات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، اور

اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدی ﷺ نے ہر شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور اب آپ ﷺ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں، کہ دین کامل اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا، اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا، اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا، یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں، ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

☆☆☆☆☆

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ آیت 177) ...... وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (البقرہ آیت 4)

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی[1] ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (البقرہ آیت 4)

(اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔)

یومِ آخر اور حیاتِ آخرت پر ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بُن سے اکھڑ جائے، اسی لیے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک، جس میں پھر موت و فنا نہیں، پہلے دور کا نام ''برزخ'' اور دوسرے کا نام ''بعث'' یا حشر و نشر اور قیامت

---

1 قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کی تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں، وہاں یومِ آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

ہے، اور ان سب کے معنی جی اٹھنے، اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں، لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس کے عالم کا نام قرآن میں اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ اور عُقْبَی الدَّارِ وغیرہ ہے، جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

☆☆☆☆☆

برزخ

موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام "برزخ" ہے، سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ:

وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (المومنون 100)

اور ان مرنیوالوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

قرآن میں آلِ فرعون کے ذکر میں ہے۔

وَ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ٥ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا، وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ. (المومن آیت 45-46)

اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا، آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گناہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزا چکھایا جاتا ہے۔ ایسا ہی نیکو کاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے، اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے، تم میں

سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے، تو دوزخ، پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام، اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا[1] جائے، ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا۔ مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے[2]۔ اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اٹھائے جائیں، اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے۔[3]

قبر کی اصطلاح

سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں،[4] وہ عموماً قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں، لیکن اس لفظ "قبر" سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں، اور ارواح و نفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآنِ پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے، اور ان ہی کے عذاب و ثواب اور رحمت و لعنت کا ذکر ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے، وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے، جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے۔

---

1 صحیح مسلم۔ کتاب الجنۃ والنار

2 صحیح بخاری۔ کتاب الجنائز

3 صحیح مسلم۔ کتاب الجنۃ النار

4 بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے، اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔ یہ غلط فہمی ان کو اس لیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر و قبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواحِ انسانی کے عذاب و ثواب اور رحمت و نعمت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

تم نیند میں ہو اور تمہارے نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے، یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے، اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے، جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے، اس جواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے، اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا، جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا[1] اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی اور اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی پر ہے، جسم خاکی نہیں، فرمایا:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (مدثر: 2)

"یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گروی ہوگی۔"

اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم بمنزلۂ آلہ کا ہے، دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ و مادیات سے پاک و بری ہو گا، تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی، اور اتنی ہی نسبت کی بناء پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اُڑتی پھرتی ہے، اور خصوصاً شہداء کے متعلق یہ آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے، اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی، اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو رویائے صادقہ پہلے گذرا ہے۔ اس میں جن جسمانی قالبوں

[1] اس سے اس شبہ کا ازالہ ہوتا ہے وہ ہم کو مردہ جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب وثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، وہ تمام تر مثالی ہی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں سڑگل کر فنا ہو گئے، یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے، اور ذرے ہوا میں اُڑ کر منتشر ہو گئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کا جزء بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے، جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے، مگر قدرتِ الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا، اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔

سوال و جواب

احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں، اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔

اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (النحل آیت 32)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک و صاف حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ط قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً

فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰاهُمْ جَهَنَّمُ۔ (النساء آیت 97)

(بے شک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یارومددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی، کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔)

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا۔ بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی۔ یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا۔ یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

☆☆☆☆☆

آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے، اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے، قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لیے جگہ خالی کر جاتی ہے، یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے، کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے، اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے، غرض

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا، جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی، کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی، اور آسمان و زمین کے ٹکڑے ٹکڑا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پھر وہ خلاق عالم اپنی صفت خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا، اور نئی زمین اور دنیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہو جاتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پر پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی۔

قیامت پر قرآنی دلائل

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔

اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ اگر اس کے عمل کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو، اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ. (المومنون آیت 115)

(اے لوگو) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى. (القیامہ آیت 36)

(کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔)

دوسری بات جو روزِ جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل و منصف ہونا ہے، اگر اچھے اور برے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے، اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکو کار، پرہیز گار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں، پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا

و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے، سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ○ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ○ (التین آیت 6 تا 8)

لیکن جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے، پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنیوالوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہوسکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ. (ص آیت 28)

(کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، ان کی طرح کر دیں، جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیز گاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔)

دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (الجاثیہ آیت 21)

(کیا انھوں نے جنھوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے، کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔)

لوگوں کو روز جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں، تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے۔ یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے، یعنی چونکہ مرکر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدیؐ نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

1- مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت عزیزؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا، کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

2- جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے، اور پھر دفعتاً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے، سبزہ نکل آتا ہے، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین سے، انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی، وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

3- دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی، جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزہ اور درخت اگائے، اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

4- حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا، خدا نے اس کو ہست و موجود کیا، پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے

اس کارخانے کو پیدا کیا، وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا، جس نے نقش اول بنایا، نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

5- دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی، پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں، مخالفت کی، تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔

اعمال کے لوازم و نتائج

جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے، تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے، اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعاتی اشیاء میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد، اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں، جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور ان کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحانی اسباب و علل

اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا، انبیاء علیہم السلام کا کام ہے، اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے، انبیاء کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اس کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے، جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی، (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب وثواب ردِ عمل ہے

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردعمل کے جس اصول پر مبنی ہے، اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے، یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے، قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے، جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثوب کا لفظ ثواب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

حصولِ راحت کا اصول

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں، عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آئندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں

موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی خوش آئند ہے، مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ نقد را بہ نسیہ مگذار، لیکن بلند ہمت اور اعلیٰ حوصلہ افزائی کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے، فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں تاکہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے، تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ دولت فردا سے بہرہ مند ہوں، ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تاکہ اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو، لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اُٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں، تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لاسکیں اور تنگدستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو، مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام اور کامیابی کا ہم کو یقین ہو، کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں۔ اسی کے لیے ایمان کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں، جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا، ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی۔

حالانکہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے، اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی

معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا، تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے۔

غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہو گی، یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے۔

وَ جَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا. (الدہر 12)

(اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی۔)

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تاکہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں ادائے نیکی اور احتراز جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت، تاکہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں، اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے، نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی وفانی لذتوں کے طلبگار ہوتے ہیں اس لیے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے، اور جو دین و دیانت اور نیکی وتقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے، وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے۔ یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى. (النازعات آیت 40-41)

(لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے)

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟

دوزخ جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدت دراز کے بعد ایک دن جہنم کی آگ رحمت الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی۔

جمہور کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ رہے گا اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو گنہگار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے۔ دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے۔ ان کی گنہگاری اس درجہ ہو گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے۔ یہ وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔ دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی۔

عذاب طویل کا سبب

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے، پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا، سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزارہا سال سے عقاب کے دینا مناسب نہیں حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لیے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پا جاتا ہے، چوری، عمل خلاف قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے؟ مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں، اور اس کو خلاف عقاب نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصول صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں، مہینوں، بلکہ سالہا سال بیمار

رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جا کر کہیں اُن چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے، اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اُس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے، اور آخر میں جان دے دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گناہ زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے، اس کی تلافی کی مدت، غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت، اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بناء پر مختلف ہوتی ہے، اسی لیے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لیے یکساں نہیں ہوسکتی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِيْقَةِ الْحَالِ.

☆☆☆☆☆

جنت

جنت کے نام

اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً الْجَنَّة (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب صفتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے، مثلاً جَنَّةُ النَّعِيم (نعمت کا باغ) جَنَّةُ الْخُلْد (ہمیشہ دوام کا باغ) جَنّٰتُ عَدْنٍ (دائمی سکونت کے باغ) جَنَّةُ الْمَاْوٰی (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے، فِرْدَوْسٌ (باغ) رَوْضَة (چمن) دَارُ الْخُلْدِ (ہمیشگی کا گھر) دَارُ الْمُقَامَة (قیام کا گھر) دَارُ السَّلَامِ (امن وسلامتی کا گھر)

جنت کا دوام

اس موجودہ دنیا میں گو لذتیں اور مسرتیں ہیں، مگر جو چیز یہاں نہیں ہے، وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت آنی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں، جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھاتے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے، اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کی نام ہے، جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے، مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے، مگر الم نہیں، مسرت ہے، مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے، انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے اس اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اسی دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے، صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیر باد کہنا، اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں، جن کا نام کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہے، اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوان طعام، اقسام شراب و شربت، انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں۔

☆☆☆☆☆

قضاء وقدر

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (القمر آیت 49)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا، مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے، اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعت قدرت اور مشیت مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے، جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا، جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں۔ اسی طرح مہندسِ ازل خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول وقواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا۔ اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت وحیات، فقر وغناء، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ نہیں۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ اس لیے اس پر ہمارا فخر و غرور کرنا بے جا ہے۔ اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سرِ نو جدوجہد میں معروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۚ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (الحدید 22-23)

(کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتابِ الٰہی میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کھایا کرو، اور جو تم کو اللہ دے اُس پر اِترایا نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کسی اِترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔)

اس آیت کریمہ نے مسئلۂ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے، کہ اس کی تائید کے لیے مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہزیمت جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم آتا ہے، اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے

کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی، نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا، کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی، محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو، کل پر حاوی ہے، اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا، اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا۔ اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں۔ اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا،

ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا۔ یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح، تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیرِ اثر ہے اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اُتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے وہ لوگو، جو ایمان لائے) کی ندا سے خطاب کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں۔ بہت سے موقعوں پر ہے:

اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ.

(اگر تم ایمان والے ہو)

تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے، اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے، وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے، اس تقریر سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں، اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے، اسی لیے اٰمَنُوْا کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے، بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا منشاء یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے، جو ایک

دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے، اس بناء پر جہاں ایمان ہے، اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆

سیرت النبی ﷺ

جلد پنجم (5)

(عبادات)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عمل صالح

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم کو لے کر آئے اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے ایک ایمان اور دوسری عمل صالح۔

کتاب سیرت النبی ﷺ کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی' اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح و بیان میں ہے۔

ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا' کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو انہی دو چیزوں یعنی' ایمان و عمل صالح پر مبنی قرار دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عمل صالح کو نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون' جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی' اسی طرح وہ بنیاد یا ستون کے بغیر بھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

ایمان کے ہوتے ہوئے عمل سے محرومی تو محض فرضی ہے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے اس کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے۔ کسی چیز پر پورا پورا یقین

آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ لیکن نادان جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا' وہ بارہا اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا عمل کو نہیں بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○ (الحج 56)

(جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے' وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔)

اسی قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے 45 موقعوں پر یہ آیت ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

(جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے۔)

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔

نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔

عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط[1] میں ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا رستہ بتایا گیا ہے۔

---

[1] رومیوں کے نام 4,3

مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہے اس کو ایمان کہتے ہیں' پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو' یہ عمل صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابوں کا مدار انہیں دو باتوں پر ہے۔

کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے اسی طرح صرف ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے علل واسباب کے تابع فرمایا ہے' یہاں کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک دفع نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے لئے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور پر سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے۔

اسی طرح دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے۔ البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ ان سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیونکہ اول الذکر کے بھی کبھی نہ کبھی راہ راست پر آجانے اور نیک عمل بجا لانے کی اُمید ہوسکتی ہے اور دوسرے کے لئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمال صالحہ کی قسمیں

''عمل صالح'' کا مفہوم بہت وسیع ہے' اس کے اندر انسانی اعمال خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں' تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں' عبادات' اخلاق' معاملات۔ اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔ اس لئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کیے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں۔

مگر فقہاء نے اصطلاح میں یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیے ہیں جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمال صالحہ کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جن کا تعلق خاص خدا سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں' دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے اس کی بھی دو قسمیں' ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے' پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

☆☆☆☆☆

عبادات

یَآ اَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (البقرہ 21)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجا لاتا ہے۔ لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے۔

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اُس کا جوہر یہ نہیں ہے کہ گذشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادات کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے۔ ساتھ ہی عبادات کے گذشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام کی ایک ہستی سے واقف ضرور تھے مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے 'لات' عزیٰ، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے ان پر جانور قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔ سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے۔ خانہ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے بت پرستی

سے تائب ہو چکا تھا' وہ کہا کرتا تھا کہ" اے خدا! مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں' اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا۔"

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی' بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک' یورپ' افریقہ' مصر' بربر' حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ " حضرت مریم " سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اوران کی مصنوعی یادگاریں پوجی جارہی تھیں، زرتشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی' ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں' سادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی۔ چین کے کنفوشس اپنے باپ دادا کی مورتیوں کے آگے خم تھے' خاص ہندوستان میں سورج دیوتا' گنگا مائی اور اوتاروں کی پوجا ہورہی تھی' عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے۔باقی تمام دنیا درختوں' پتھروں' جانوروں' بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کررہی تھی۔

غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر' آسمان سے زمین تک مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی' ایک بے آب وگیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

(البقرہ آیت 21)

(لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔)

سابق کتب الٰہی کے ایمانداروں کو آواز دی گئی۔

يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ (آل عمران آیت 64)

(اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عقیدۃً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی

پرستش نہ کریں۔)

صرف ایک خدا کی عبادت

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوت محمدی ﷺ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کردی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکادیں اور صاف اعلان کردیا کہ:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا
(مریم آیت 93)

(آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔)

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں' نہ زمین میں' نہ آسمان کے اوپر اور اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ' اور رکوع وقیام کی مستحق ہے اور نہ اس کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جاسکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جاسکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جاسکتی ہے اور نہ اس سے دعا مانگی جاسکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لئے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے۔

اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام آیت 163)

(بلا شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لئے ہے)

کفار کو بتوں' دیوتاؤں' ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ o وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ

اَعْبُدُہٗ o وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ o وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُہٗ o
لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ o (الکافرون)

(اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو میں نہیں پوجتا اور' اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اس کو پوجنے والا ہوں جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اُس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے۔)

خارجی رسوم کا وجود نہیں

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت' نہ دریا میں جاکر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب' نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت۔ نہ دیوتاؤں، دیبیوں' بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت' نہ سامنے آگ کے روشن کرنے کا حکم، نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت' نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم' نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف، اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ' نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید۔ ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے' اس کے لئے صرف ایک پاک ستر پوش لباس' پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے' اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں

اسلام میں عبادت کے لئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہیں۔ محمد رسول اللہ کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں' نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں' نہ ربی ہیں نہ حاخام ہیں' نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لئے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت' یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے' آپ باتیں کرتا ہے' آپ عرضِ حال کرتا ہے۔ ہر مسلمان

اپنا آپ برہمن' اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے' یہاں حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو میں جواب دوں گا۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المومن 60)

(تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔)

خارجی کشش کی کوشش چیز نہیں

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش' دلفریب' موثر اور بارعب بنانے کے لئے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا' کہیں ناقوس اور قرنا کی بارعب آوازیں تھیں' کہیں ساز و ترنم اور نغمہ و بطور کی دلکش صدائیں تھیں' کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور۔

لیکن دین محمدی ﷺ کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لئے دل کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید

ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے بت خانوں سے باہر پوجا نہیں' آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں' گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں۔

لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت' نہ محراب و منبر کی حاجت' وہ دیر و حرم' معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا' "مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے۔

وَ جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا

(اور میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی۔)

پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان خدا کے لئے کرتا ہے۔ مثلاً نماز' دعا' قربانی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس تنگ دائرہ کو بے حد وسیع کر دیا' اس تعلیم کی رو سے ہر وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے کیا جائے عبادت ہے۔

اسلام میں خدا کے لئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کیلئے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدے کے لئے ہو لیکن اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش' دکھاوا' حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا' وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت' خوشنودی اور رضامندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا' محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعۃً مٹا دیا' دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں' اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں لیکن ان کی غرض وغایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں' دین کے کام ہیں اس لئے دین اور دنیا کے کاموں میں کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔

تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں معروف رہتے تھے فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو' تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو' تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو! اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو۔ غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا' خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

☆☆☆☆☆

نماز

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب' بوڑھے جوان عورت مرد بیمار وتندرست' سب پر یکساں فرض ہے۔

یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی' اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو۔ اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو' اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔ اگر رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ اگر سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو۔

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل' زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان و رحیم کی یاد اور اس کی بے انتہا احسانات کا شکریہ' حسن ازل کی حمد وثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار۔ یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے' یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرضِ نیاز ہے۔ یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے' یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بے قرار روح کی تسکین' مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے۔ یہ فطرت کی آواز ہے۔ یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں

میں کوئی ساز ہے جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے' یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا فطری جواب ہے۔

قرآن نے جابجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں۔ جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو۔

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے۔

چنانچہ سورۂ روم (آیت 30) میں پہلا حکم دیا گیا کہ:

فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا

(اپنا منہ ہر طرف سے پھر کر دین توحید پر سیدھا رکھو' وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے)

اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے:۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (الروم 31)

(اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ)

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے' یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور پر زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "نماز دین کا ستون ہے" جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے۔ اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔

نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع' توبہ و انابت' پشیمانی و شرمندگی' اطاعت

وبندگی اور خدا کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار نیز دل و دماغ اور نفس، روح میں پاکی' صفائی وطہارت پیدا کرنا ہے۔ اس بنا پر نماز کے لئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو ونما ہو۔

مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہِ عالم کے دربار میں کھڑا ہے۔ ہاتھ باندھے رہے۔ نظر نیچی کئے رہے' طور وطریق اور حرکات وسکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے' نماز کی جگہ پاک ہو' بدن پاک ہو' کپڑے پاک ہوں' ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے! اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیات پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے' تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر موثر انداز میں کیونکر پیدا ہوگا' یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری و ساری ہے' اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز' اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کردے گا۔

اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت سکولوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی' کھیل میں فریقین کی ہمرنگی وہم لباسی' فوجوں میں وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہم قدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصل کیفیت سے متکیف ہوں۔ ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پر کیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم وبیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے۔ اسی لیے جلسوں میں ایک ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آجاتا ہے۔ نفسیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے۔

غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لئے ان طبعی و نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے۔ نماز کے آداب' شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

نماز کے اخلاقی' تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ' روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی' اخلاقی' تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے' آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں اور ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔

اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی' وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا۔ چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے۔ متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر اور پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے' ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا اب اکسیر بن جاتا ہے۔

1- ستر پوشی

نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز "ستر پوشی" کا خیال ہے' انسان کا شرم و حیا کی نگہداشت کے لئے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔

عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے' بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے' یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں۔ اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا' یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں آیت نازل ہوئی۔

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف 31)

(ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔)

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لئے پیشانی سے

لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا' اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر پوشی پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لیے اُن کو ستر پوش بنا دیا۔

افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے' دوسری طرف متمدن قومیں زیب و زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی ہیں۔

مرد کو گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتوں کو تیز' خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

2- طہارت و پاکیزگی

اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے' اقراء کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا۔

وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر آیت 4)

(اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔)

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کیے اور آنحضرت نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اور اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو۔

اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی مطلق تمیز نہ تھی۔

3- صفائی

نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا

رکھنے پر مجبور کرتی ہے دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں' ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

4- پابندیٔ وقت

انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں۔

انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے۔ اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں' جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی با قاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا۔

نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے' ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں۔ وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

5- صبح خیزی

طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہیں' جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے۔ جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا' صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے رات کو نمازِ عشاء کے بعد بیکار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے۔ تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو موذن کی پرتاثیر آواز:

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ

(سونے سے نماز بہتر ہے)

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے۔

6- خدا کا خوف

ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے تو رحمت الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے' اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے' وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں۔

غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ط (العنکبوت آیت 45)

(بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔)

7- ہشیاری

نماز عقل' ہوش' بیداری اور آیات الٰہی میں تدبر اور غور' خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے اس لیے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم واحساس کو کھو دیں' نماز کی حقیقت کی منافی ہیں۔

8- مسلمان کا امتیازی نشان

مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی۔ قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔ نماز کے ذریعے یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی' وہ مسلمان ہے

9- جہاد کی تیاری

باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے اس فرض کے انجام دینے

کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اس تیاری کا نقشہ ہماری روانہ کی نمازیں ہیں۔

10- اخلاق

تمام عبادات' بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے۔

تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے۔ روزہ' حج' زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے۔ زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے۔ حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ فرائض نفس کو متنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے۔

11- اُلفت ومحبت

نماز مسلمانوں میں باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی۔ ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی' اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔

12- غمخواری

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ جب امیر وغریب سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور امراء اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی' ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

13- اجتماعیت

اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے تمام قوموں نے اس کے لئے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کئے ہیں۔

جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں' کانفرنسوں اور دوسرے جلسے جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے لیکن یہ

اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے۔ اجتماعیت کام چاہتی ہے' اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہ رنگ رلیوں' رقص و سرود' شراب خواری' قمار بازی' چوری' بدنظری' بدکاری' رشک وحسد' بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے' میلے ٹھیلے عرس' ہولی' تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی ہیں تھیں اور اب بھی ملتی ہیں' قبور پر ناجائز اجتماع' غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں' اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا' ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لئے کوئی مشغلہ مقرر کرے' جس سے قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رخ کی طرف رہے۔

چنانچہ اسلام نے اسی لئے روزانہ جماعت کی عام نمازیں' ہفتہ میں جمعہ کی۔ اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے۔ حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کیساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ وانابت کو قرار دیا۔

اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

14- کاموں کا تنوع

انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمہ رنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے لیکن اگر انسان کے دل و دماغ' اعضاء وجوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں تو سکون واطمینان' عیش وراحت اور دلچسپی کی لذت جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے مفقود ہو جائے' مفید سے مفید کام سے دنیا چیخ اٹھے۔ اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مفید طریقے پر کی ہے جس میں انسان کو حرکت وسکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے۔

15- تربیت

انسان کی عملی کامیابی استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے

شروع کیا پھر اس پر عمر بھر قائم رہے اسی کا نام عادات واخلاق کی استواری اور کریکٹر کی مضبوطی ہے۔ جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو۔ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بارے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان میں استقلال' مواظبت اور مداومت شرط ہے اس لئے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر اور چیز نہیں ہو سکتی۔

16- نظم جماعت

کسی قوم کی زندگی' اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی' یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے' اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا' ایک دوسرے سے شانے شانہ ملانا اور یکساں حرکت وجنبش کرنا ان کی قومی زندگی کی مستحکم ومضبوط دیوار کا مسالہ ہے۔

جس طرح نماز کی درستی صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون' تضامن' مشارکت' میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ صف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم خوب مل کر کھڑے نہ ہو گے تو تمھارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔

17- مساوات

یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے۔ یہاں امیر وغریب' کالے گورے، رومی' حبشی' عرب وعجم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں' جماعت کی امامت کے لئے حسب ونسب' نسل وخاندان' رنگ روپ' قومیت اور جنسیت عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی' بلکہ علم و دانش فضل و کمال اور تقویٰ وطہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شاہ وگدا اور شریف ورذیل کی تفریق نہیں۔ سب ہی ایک

زمین پر ایک امام کے پیچھے' ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے۔

کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

18- اطاعت

جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے نماز با جماعت مسلمانوں کی اسی زندگی کا رمز ہے کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں' اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لئے بانگ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

19- معیارِ فضیلت

نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم وفضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے' اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کو میسر ہے۔

20- روزانہ کی مجلس عمومی

آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی سیاسی وقومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوئی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز جمع کرنے والی ہے)۔ سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے' یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی' اجتماعی' سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا جس کے لئے ہر وقت سے ہر مسلمان کا کسل وسستی کے بہانہ کے بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اس کے مذہبی واجتماعی وتمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے' اس کی

شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے' مسجد مسلمانوں کے قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے اسی طرح جب مسلمان زندہ تھے' ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی۔ ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دارالامارۃ تھا' وہی دارالشوریٰ تھا' وہی بیت المال تھا' وہی صیغہ جنگ کا دفتر تھا' وہی درسگاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدے کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلاف باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے' اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرلشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے' اسلام کی نماز انہی رموز و اسرار کا گنجینہ ہے' یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت' اطاعت پذیری و فرمانبرداری اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے اسی لئے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے' نہ انقیاد امامت ہے نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے۔ اسی بنا پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرمادیا:

فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ (احمد۔ ترمذی۔ نسائی۔ ابن ماجہ)

(تو جس نے اس کو چھوڑا' اس نے کفر کا کام کیا)

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان' شراب بے نشہ اور گل بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

☆☆☆☆☆

زکوٰۃ

وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم

اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ باہم پہنچانا ہے۔

زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے۔ فقہی اصطلاح میں ''زکوٰۃ اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے' جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔''

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں

زکوٰۃ بھی اُن عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن اُن کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب میں تھی۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل

محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام

دیا' اس نے نہایت خوبی اور دقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا۔ انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً کم آمدنی سے ہوتا ہے اس لئے اس نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا۔

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ

یہ آٹھوں مصارف نیکی' بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور صنف کو محیط ہیں' فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے' جیسے بوڑھے' بیمار' اندھے' بولے لنگڑے' مفلوج' کوڑھی' یا وہ محنت کر سکتے ہیں لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں معروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے مبلغین' مذہبی معلمین' بالغ طالبعلم لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

وَ الْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے اپنے کام کی اُجرت پا سکتے ہیں۔ اور وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (جن کی تالیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے وَ فِي الرِّقَابِ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں جن کی گردنیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے' اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی ادا نہیں کر سکتے۔ وَالْغَارِمِيْنَ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے اور حسب ضرورت بھی

اس سے مذہبی یا سفر حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لیے جاسکتے ہیں اور وَابْنَ السَّبِيْلِ (مسافر میں) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی' پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہوسکتی ہے' یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

تزکیۂ نفس

انسانوں کی روحانی و نفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف و رجاء اور تعلق و محبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا بڑا سبب 'ماسوی اللہ کی محبت اور مال و دولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے' زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے۔

باہمی اعانت کی عملی تدبیر

زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجتمندوں کی امداد ہے' انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے' اور اس کی تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آیند الفاظ استعمال کیے ہیں' لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہوسکتی' محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا' اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی' خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی۔

دولتمندی کی بیماریوں کا علاج

دولتمندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکہ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا' یہودیت کی طرح بعض ایسے مذاہب ہیں جن میں نہ تو دولتمندی

کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفلسی اور غربت کو سراہا گیا ہے بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے لیکن عیسائیت اور بودھ مت' دو ایسے مذہب ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے' عیسائیت کی نظر میں دولت اور تمول' نجات کی راہ کا کانٹا ہے' بلکہ کوئی انسان اُس وقت تک نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس خدا کی راہ میں لٹا نہ دے' انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولتمند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا:

اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا' تب آ کے میرے ہولے۔"

وہ دولتمند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا' تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

"میں تم سے سچ کر کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔" (متی (16-21-24)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے' اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں۔

لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا' اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اُس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی' دشمنی ہوئی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانشمندی اور اصلاح ہے اس لئے یہ طریقہ کار شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے' نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے۔ جس طرح دولتمندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کا بچانا ایک نبوت

عظمیٰ کا فرض تھا' دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولتمند ایک نیکوکار غریب سے بدر جہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے' اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے' لعنت نہیں۔

ہنر ہے عیب نہیں' خیر ہے شر نہیں' چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آرہا تھا' اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے حل کر دیا۔

آنحضرت ﷺ نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرمادیا اور بتادیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے' اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر ذریعہ ہے' اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری اور شر انگیز ہے۔

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں' اور اوپر گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقاء اور نمو۔ بقاء سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں' کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے' اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے' اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو' اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔ ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے

کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں' بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی' جس کو فطرۃً کوئی برداشت نہیں کرسکتا اور اس طرح زکوٰۃ کا بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے۔ کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو' یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے۔

اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو' اور اسی بناء پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھاسکے۔

صحابہ کرامؓ اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے' حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تاکہ اُن کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہوجائے۔

☆☆☆☆☆

روزہ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ 183)

روزہ کا مفہوم

روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے عربی میں اس کو "صوم" کہتے ہیں' جس کے لفظی معنی "رو کنے اور چپ رہنے کے ہیں"

بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں "صبر" بھی کہا گیا ہے جس کے معنی "ضبط نفس" ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابط اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔

روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسان حرص وہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں یعنی کھانا اور پینا اور عورت اور مرد کے جنسی تعلقات' انھیں سے ایک مدت متعین تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

اسلام کا روزہ اپنی ابتداء اور غایت کی تشریح میں اپنے پیرووں کی وکالت کا

محتاج نہیں اور بہ آواز بلند مدعی ہے:

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝ (البقرہ 183)

(مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض ہوا تا کہ تم پرہیزگار بنو)

روزہ کی حقیقت

انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل واسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے۔ وہ مختلف اغراض کا پابند ہے۔ اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں' اخلاق جس کا ایک حدتک روحانیت سے تعلق ہے اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی' اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں' ضرورت اور غرض اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہوجائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف واغراض و مقاصد کا جوایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟

ہمارے دل میں آرزوں کا ایک ڈھیر ہے' تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑوں' عالیشان عمارتوں' لذیذ غذاؤں اور تیزرفتار سواریوں کے بغیر' جی نہیں سکتے؟ فرزند وعیال' زر و مال' اور خدام وحشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی' اور زندہ رہے ہیں' یہ روایت عام ہے کہ ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہوگئے اور نہایت پرمسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع

دائرہ ایک دولفظوں میں محدود ہوکررہ جائے' اور وہ مایہ قوت وغذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا' روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سد رمق پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ سد رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد ومنشا انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط، وسعت تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے۔

اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دوباشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فروق وامتیازات کو محیط ہوگی' انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل وخونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی۔

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل وشرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے' جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت وغذا کی طلب وحرص سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں' اگر یہ طلب وضرورت فنا ہوجائے تو ہم کو دفعتہً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے۔

لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کردی ہے اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا' کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے مجتنب ہوکر تھوڑی دیر کے لئے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہوجانا چاہئے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک

کی اطاعت و عبادات ہے اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان بھی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کردیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی۔ اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃ اس حقیقت میں شریک کرلیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (البقرہ 183)

(مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا' تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔)

روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے' یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچالینا اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا' لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔

"تاکہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو۔" (البقرہ 185)

روزہ کے مقاصد

اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں۔ گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہوچکا ہے' مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی کوئی تعلیم ربانی' محض حکم کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے' اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر قائم ہے' اور ان مصلحتوں اور منفعتوں کے

اصول اور جوہر کو خود محمد کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے' چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے تین مختصر فقروں میں بیان کر دیے ہیں۔

(1) لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (البقرہ 185)

(2) وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرہ 185)

(3) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ 183)

(1) تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔

(2) تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔

(3) تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا' یہاں تک کہ وہ مکالمہ الٰہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربانی نے ان پر نزول کیا۔

حضرت موسیٰ ؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کیے' تب توراۃ کی لوحیں ان کو سپرد ہوئیں۔

حضرت عیسیٰ ؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے' تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلا۔

محمد رسول اللہ غار حرا میں ایک مہینہ یعنی تیس دن مصروف عبادت رہے۔ اس کے بعد فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حامل قرآن کی پیروی

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے۔

یہودی بھی حضرت موسیٰ کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف

چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے تھے۔

عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہیے تھا مگر انہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام وسنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی۔

اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی میں چند دن اسی طرح گزاریں' چنانچہ فرمایا:

"اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ میں) روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔" (البقرہ 183)

دین الٰہی کی تکمیل' نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گزشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کی چند ہی روز میں بھلا دیا۔ محمد رسول ﷺ کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ

یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے' بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا' شکریہ ہے' اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے' وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی' وہ ہدایات روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی' جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ' اور ظلماتی سے نورانی بنایا' پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تو پہنچایا' ان کی وحشت کو تہذیب واخلاق سے، ان کی جہالت کو علم ومعرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت ودانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا۔ جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیے اور فضل و دولت اور خیر وبرکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور

کر دیا' جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا' قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لیے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی۔ اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔'' (البقرہ 185)

اس ہدایت ربانی اور کتابِ الٰہی کے عطیہ پر شکر گزاری کا یہ رمزو اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے۔

1۔ ''تقویٰ'' دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی ہے اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو۔

2۔ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے' اور اُس وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کا احساس کیونکہ ہوگا' بقول حافظ ابن قیم سوزِ جگر کے بجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے' روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار' رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت ''بادِ رواں'' کی طرح ہوتی تھی' اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور ان کو شکم سیر

کیا جاتا ہے۔

3۔ انسان کو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہو' اور مال ودولت سے مالا مال ہو تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی' اور سختیوں کا خوگر بنائے۔ جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے' بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر وضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے' یہی سب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدانِ جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے' دوسرا نہیں کرتا' یہ گویا ایک قسم کی جبری فوج ورزش ہے' جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے' اور دنیا کی کشمکش جدوجہد' سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے۔ اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی "صبر کے" کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے' تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

4۔ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لئے ضروری ہے' مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے۔

اسلام میں ہفتہ وار مسنون ومستحب روزے بھی ہیں' مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے۔ جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں' ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار وسحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو' اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

5۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور معروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصا حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام

میں صرف ہوجاتا ہے' اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا بند کردے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے' یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جاسکتا ہے' اگر ہمیشہ نہیں تو کم ازکم سال میں ایک دفعہ تو غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

6۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لیے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے' جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل ودماغ تخمۂ معدی کی مصیبت سے پاک ہو' چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

7۔ روزہ بہت سے گناہوں سے انسانوں کو محفوظ رکھتا ہے اس لیے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

8۔ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہوجائے گی' روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو' تھوڑی دیر کے لیے سرد کردیتا ہے' کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں' دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں۔ دل ودماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں' ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے۔ یہ فرصت کی گھڑیاں' یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت' یہ دل ودماغ کے جمعیت خاطر' یہ جذبات کا سکون ہوتا ہے۔ جو ہمارے غوروفکر' اپنے اعمال کے محاسبہ' اپنے کاموں کے انجام پر نظر' اور اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کردیتا ہے' اور نیکی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق وشوق کو ابھارتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے' اس میں تراویح ہے اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے' اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے' اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت کی فیاضی تو گویا سدا بہار تھی' لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔

9۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے' بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے' اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ گویا روزہ رکھا ہی نہیں گیا' یا یوں کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہو گیا' لیکن روح کا روزہ ہوا۔

اسی کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ

"روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا چھوڑ دے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا'

"روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتیں نہ بکے اور نہ جہالت (غصہ) کرے یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو' اور گالی بھی دے' تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔"

بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو' صحابہ نے دریافت کیا' یا رسول اللہ ﷺ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے' جھوٹ اور غیبت سے"

چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

10۔ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا

گیا ہے کہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے' جو ریا اور نمائش سے بری ہے' جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے' دوسروں پر اس کا راز افشانہیں ہوسکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

11۔ اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا اور لذات کو چھوڑتا ہے' اس لیے

اَلصَّوْمُ لِیْ وَ اَنَا اَجْزِیْ بِہٖ

(روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔)

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے' لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (الزمر 10)

(صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے۔)

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی ایک صبر کی ایک قسم ہے' اس لیے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

12۔ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے' بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے اسی لیے مشکلات کے حل کرنے کے لیے دعا اور صبر کرنیک کی خاص ہدایت ہوئی ہے۔

"اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔" (البقرہ 153)

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے' لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں' کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں' اس لیے اس کی مہارت اور مشق کے لیے شریعت نے روزہ رکھا ہے' اسی لیے آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی کیے گئے ہیں۔

13۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطاپوشی، گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے ارشاد ہے:

"اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والے عورتیں اور خدا کو زیادہ یاد
کرنے والے مرد اور زیادہ یاد کرنے والی عورتیں ان کے لیے اللہ
نے تیار رکھی ہے' معافی اور بڑی مزدوری۔" (الاحزاب 35)

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے' اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

☆☆☆☆☆

حج

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (آل عمران 97)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔اس کے لفظی معنی "قصد اور ارادہ" کے ہیں' اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے۔لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جاکر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہوکر کچھ آداب اور اعمال بجا لانے کا نام ہے۔

حج کی حقیقت

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اوراطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کوعبودیت کے اظہار کوکسی طرح بجا لانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجا لائے اور خدا کی نوازشوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے۔

یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے' یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کرکے ظاہر کرتے ہیں۔

تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں اس لیے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈواتے نہ تراشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں اور نہ خوشبو لگاتے ہیں اور نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ تین دن کے سفر کے گردو غبار میں آتے ہوئے اور دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے۔

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِیْکَ لَکَ (صحیح مسلم)

(میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں، سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔)

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں' جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرتے چلتے ہیں اس لیے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں۔ پھر جہاں سے جہاں تک صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے پھر منا پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہوکر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں۔ خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں اور آئندہ زندگی کے لیے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت' بندگی اور اطاعت کا نیا عہدو پیان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے۔ یہ تاریخی میدان اس

تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر دور دراز کے سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع ملتا ہے اور لاکھوں بندگانِ خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں ایک ہی لباس اور شکل وصورت ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب وگیاہ اور خشک میدان اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہوکر دعا مغفرت کی پکار گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لیکر محمد رسول اللہ ﷺ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوکر' ایسا روحانی منظر ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی۔ پھر اپنی نذر کے دن پورے کرکے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت اور اسی فدویت، اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اس میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت میں اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ کے ہی الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں (صحیح مسلم کتاب الحج)

"میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا موحد بن کر اور میں ان میں سے نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔" (الانعام 80)

"میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام دنیا کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام) کا اقرار کرتا ہوں۔" (الانعام 163)

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کے ارکان

حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں۔

اِحرام

تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ نماز کے لیے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے۔ احرام بھی حج کی تکبیر ہے۔

احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے۔ اس لیے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہوجاتی ہیں جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کرسکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔ بی بی سے متمتع نہیں ہوسکتا کہ یہ نفسانی وشہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے۔ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ وجلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے، لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی۔ اس لیے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ وگدا اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب تن کیا جائے۔ ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لیے باہر رہے۔

یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے جو اس لیے اس وقت کے لیے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو۔ یہ گویا شہنشاہ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ، بے تکلف اور زیب وزینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف، یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر دعائیں مانگنا، اس رسم کو

ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی۔ چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے اس لیے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ

رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

(خداوند ہم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے اسی لئے آنحضرت نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے' صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو" اور حکم ہوا کہ:

"اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔" (الحج 29)

حجر اَسود کا اِستلام

حجر اسود کے لفظی معنی کالے پتھر کے ہیں' یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے' خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا' کبھی سیلاب میں بہہ گیا' اور کبھی آگ میں جل گیا' اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں' مگر اس عہد عتیق کی یاد صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا' اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لیے نکال کر لے گئے' اور پھر واپس کر گئے۔)

یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا' اور اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے۔ اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے۔ اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لیے

وہ ایک نشان کا کام دے ۔ ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں' سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں' ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں یہ نہ سہی تو اس کی طرف اشارہ بھی کر کے قناعت کر سکتے ہیں' یہ پتھر کہنے کے لیے تو ایک معمولی پتھر ہے مگر ایک مشتاق زیادت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی' شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک کے مقدس لب' یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدینؓ صحابہ کرامؓ ائمہ اعلام' اکابرؒ اسلام اور حکمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں' ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور بایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار متوالے نے اس کو چوم کر کہا۔

"اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے' نہ تو
نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان ۔لیکن میں اس لیے تجھ بوسہ دیتا ہوں
کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا ہے۔"

الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں' بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے۔ ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں' جو اب برائے نام رہ گئی ہیں تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں' صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے' جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مروہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا۔ بعض

روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہؓ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہوگئے تھے تو حضرت ہاجرہؓ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زم زم کا چشمہ ان کو نظر آیا' یہ صفا و مروہ کی سعی انہیں اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے' بہر حال حج میں پہلے صفا پر، پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؓ کو نظر آئے۔

وقوف عرفہ

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے۔

یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا اپنا عہد باندھتے ہیں۔ یہیں "جبل رحمت" کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔

عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز' حشر کے بیان سے ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر موثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کو طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے۔ ہر شخص کو داہنے بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے' عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے۔ اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے

چور ہو جاتے۔ اسی لیے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا۔ اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام ہے اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا۔

منیٰ کا قیام

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے' جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ" کی تمام گلیاں ہیں۔رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی۔ ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا۔ اس لیے شہر سے چند میل فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لیے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے' یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں' یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں' بازار لگتے ہیں ۔خرید وفروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی اور بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد وعبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کے مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف' محبت' مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے فرمایا:

"خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔" (البقرہ 203)

قربانی

یہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں۔

"اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔" (الحج 28)

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے۔

"تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔" (البقرہ 196)

حلق راس

منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں' یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے' کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے' ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے۔ تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے ہیں۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی' چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

رمئ جمار

منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں' کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کے لیے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا۔ جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا۔

ان رسوم کی غایت

اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے

طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دور ترقی کا عہد آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات و احساس کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے' تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے۔

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں' جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں اور اسی لیے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شَعَآئِرِ اللّٰہ اور حُرُمٰتِ اللّٰہ ہے' یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمات اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکان حج ہے۔

حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے۔ تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب

حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو' وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے' کسی کو تکلیف نہ دے' یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے' شکار تک اس کے لیے جائز نہیں' کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے۔

مرکزیت

خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرہ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور

اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا' یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں' جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بستے ہیں' مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں' مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں' مگر وہ سب کے سب ہی باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر' وطنیت' قومیت' تمدن و معاشرت' رنگ وروپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن، ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرتی (ملت ابراہیمی) اورایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہوجاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس احرام میں' ایک وضع میں' دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں' یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسان میں جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کے اسباب ہیں اس لیے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے' بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کرکے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتی ہیں۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں' مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی ﷺ کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی۔ لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد وکوشش میں معروف ہیں' مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیمؑ کے لیے

مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں' لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم' تمدن' مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے آج دنیا کی قومیں "ہیگ" (ہالینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اُس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے' یہ حج کا موسم ان سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا' یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر' اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پاتی تھی۔

رزق ثمرات

اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بسنے والوں کے لیے رزق کا کوئی سامان کیا جائے۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی کہ خداوند میں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب وگیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے۔ تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔

اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لیے زکوۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی' لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی۔ وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتے۔ جو ان کے منصب کی عزت اور

شرف کے مناسب نہ ہوتا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنا دیا۔

تجارت

قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے' چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے:

> اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصدے جا رہے ہوں' اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔(المائدہ 2)

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔ تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے اس لیے اسلام کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں۔ کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے' بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے اور فرمایا:

> اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو تو بہتر ہے' کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے' تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے) (البقرہ 197-198)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں' درست نہ تھا کہ اول طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی

آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں ۔ یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے - یہ مقام گویا مسلمانوں کی عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالک اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے۔ جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے۔ وہ کون سا اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آسکتا' لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا' یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت

روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکان حج کے ادا کرنے سے قلب وروح میں پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک حیثیت تو وطنی' دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے۔

تاریخیت

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اورحرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے۔

آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے۔

یہیں حضرت آدمؑ نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا' یہیں حو[illegible] نے آکر ان سے ملاقات کی' یہیں نوح کی کشتی نے آکر دم لیا۔ حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہاں پناہ لی' محمد رسول اللہ ﷺ نے یہیں ولادت پائی۔ یہیں وہ پہاڑی [illegible] (صفا) جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے' یہیں [illegible] دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی۔ یہیں وہ چشمہ [illegible]

(زمزم) جو حضرت ہاجرہؓ کو پیاس کے عالم میں نظر آیا' یہیں وہ خانہ کعبہ ہے جس کی چار دیواری کو ابراہیمؑ واسماعیلؑ نے بلند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ مشعر حرام اور عرفات ہیں۔ جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ پتھر (حجراسود) ہے جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں وہ گلیاں اور راستے ہیں جو جبریل امین کی گزرگاہ تھے' یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی۔ یہی وہ صحن حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ترپن برس بسر کیے اور یہی وہ مقام ہے جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے۔

کیا قرآن پاک کا ارشاد انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں' جہاں اس نے کہا:

فِيهِ اٰيَاتٌ م بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ (آل عمران 97)

اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں' ابراہیمؑ کے قیام کی جگہ۔

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے۔ اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے۔ اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے' جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے' جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے۔ آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں' اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ' عقیدت کو مضبوط' اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے۔

خالص روحانیت

"حج کی حقیقت" میں گزر چکا ہے کہ وہ اصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں۔ یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے۔

حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں۔

اسی لیے سرور کائنات علیہ الصلوٰت نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں' بلکہ حج "مَبْرُوْر" رکھا ہے یعنی "وہ حج جو سراپا نیکی ہو" اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سائلوں کے لیے خاص ہے' حج کی روحانیت درحقیقت توبہ' انابت اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہداور آئندہ کے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے۔

الغرض "حج" اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی' معاشرتی' اقتصادی' سیاسی' یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمان کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

☆☆☆☆☆

جہاد

وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (الحج 78)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا۔ مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے' اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو برتو پردے پڑ گئے ہیں اُن کو اُٹھایا جائے۔

''جہاد'' کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں' مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے' جہاد اور مجاہدہ' فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں' اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں' یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد' قربانی اور ایثار گوارا کرنا' اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں' اس راہ میں صرف کرنا' یہاں تک کہ اس کے لئے اپنی' اپنے عزیز واقارب کی' اہل وعیال کی' خاندان وقوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا' ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا' ان کے حملے کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

1۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے۔ دنیا کا تمام شر وفساد جہالت کا نتیجہ ہے۔ اس کا دور کرنا ہر حق طلب کیلئے ضروری ہے۔ ایک انسان کے پاس اگر عقل و

معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے' تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہوسکتی جو دلیل وبرھان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے' اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (النحل 125)

(تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کردے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر۔)

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے' جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل' اپنی آپ موعظت' اور اپنے لیے آپ مناظرہ ہے' قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لیے قرآن سے باہر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

2۔ جہاد بالمال: انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشاء بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے اہل و عیال کے آرام وآسائش کے لیے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لیے۔ دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں' اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے۔

3۔ جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان ومال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے۔

4۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس' یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے

اُن کے تمام اقسام میں شامل ہے جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو' اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہوکر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کردینا ہے' نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں' تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبۂ کمال ہے۔ ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کو بخش دی جائے یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کردی جائے۔

دائمی جہاد

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت' علم دین کی اشاعت' حق کی نصرت' غریبوں کی مدد' زیر دستوں کی امداد' سیہ کاروں کی ہدایت امر بالمعروف نہی عن المنکر، اقامت عدل' ردظلم اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے' یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش وسکون' ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے' سورۂ آلِ عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں آخری آیت ہے۔

> اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو' اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ ' اور کام میں لگے رہو' اور خدا سے ڈرو' شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔(آیت 200)

یہی وہ جہادِ محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے۔

☆☆☆☆☆

عباداتِ قلبی

اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے اس لیے تمام امورِ خیر' خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں' فقہاء نے صرف جسمانی اور مالی عبادات سے بحث کی ہے لیکن حضرات صوفیا نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے' اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرضِ منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیا نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے' جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے' پیشِ نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے' اور نہ تصوف کی' اس کا مقصود اُن فرائض کو بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل' صبر اور شکر ہیں' یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لیے ان کا نام ''قلبی عبادات'' رکھا جاسکتا ہے یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے' جسد بے روح بن جاتے ہیں' یہ بات گو یہاں بے محل ہے مگر کہنے کے قابل ہے کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمالِ تصوف کو آزاد و بے قید کر دیا ہے۔

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس

بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو۔ یہ تقویٰ ہے' پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضا مندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے'' یہ اخلاص ہے' پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے یہ ''توکل'' ہے' اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے براچاہنے والوں کا بھی بُرا نہ چاہا جائے۔ یہ صبر ہے۔اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے اس کو خدا کا فضل وکرم سمجھا جائے اور جسم وجان اور زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہاک صرف کیا جائے یہ ''شکر'' ہے۔

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟

تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے' عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے' پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں' لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی بات کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر وناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے' دوسرے لفظوں میں یوں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے' یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے' قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج 32)

(اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتے ہیں تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔)

اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا (مسلم)

(تقویٰ یہاں ہے)

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا' جس سے بے شک وشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے' جو تمام نیکیوں کی محرک ہے' اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے' اور یہی سبب ہے' کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت' ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار

اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی نے نسل' رنگ' وطن' خاندان' دولت' حسب نسب' غرض نوع انسانی کے ان صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیاز قائم کر دیا جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے' اور اس لئے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے چنانچہ قرآن پاک نے بہ آواز بلند یہ اعلان کیا۔

> "ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لیے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔" (الحجرات 13)

اس اعلان کو آنحضرت نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا الکرم التقوی یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے' اور اسی کے لیے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں' برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔

☆☆☆☆☆

اِخلاص

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے۔ اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغہ گوشت سے وابستہ ہے' عقائد ہوں یا عبادات' اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے۔ اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

"ہشیار ہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہوتا ہے۔ ہوشیار رہو کہ وہ دل ہے۔"

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے' اس لیے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے' اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود نمائش، جلب منفعت' طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو' بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو' اسی کا نام اخلاص ہے۔

قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض وغایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے' فرمایا:

"کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا

بنالیا۔" (الفرقان 43)

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو' رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے۔

"کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گذاری کو اللہ کے لیے خاص کر کے اس کی عبادت کروں' اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں' کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں' بڑے دن کے عذاب سے' کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں' اپنی اطاعت گذاری کو اس کے لیے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو۔" (الزمر 11 تا 15)

ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو' یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے۔ کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے' لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض دکھاوا اور نمائش تھا تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائے گی۔ اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو۔

☆☆☆☆☆

توکل

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آلِ عمران 159)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے۔ عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے' بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرے یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کردے گا 'یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا ۔ اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں' لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں' لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا ' کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل' اسباب وتدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے۔ حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورا ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے' تو اللہ تعالیٰ اُس میں ضروری ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدابیر اور جدوجہد وکوشش کا ترک ہی توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا اور ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی وسرگرمی کی تاکید نہ فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم

دیتا' نہ بدر واحد اور خندق وحنین میں سواروں' تیراندازوں' زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جاجا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے' حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے' تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو' مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کرلو' اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کردو' اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا' اگر ایسا نتیجہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت ومصلحت اور مشیت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو' اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ اور اثر ہے' بلکہ یہ سمجھو کہ خداتعالیٰ کا تم پر فضل وکرم ہوا' اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا۔

بعض لوگ تعویذ گنڈا غیر شرعی جھاڑ پھونک' ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدابیر کو ان چیزوں سے مطلب براری کرنا ہی توکل ہے' جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کردیئے جائیں گے یہ وہ ہونگے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے۔ جو بدشگونی کے قائل نہیں' جو اپنے پروردگار پر اعتماد اور توکل رکھتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو تعویذ گنڈا کرتے ہیں وہ توکل سے محروم ہیں۔ اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہوکر واپس آتے ہیں۔

اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں' کیونکہ پرندوں کو اُن

کے گھونسلوں میں بیٹھ کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے بلکہ اُن کو بھی اُڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں' اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

"اور جو کوئی اللہ سے ڈرے وہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے' بے شک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچا کر رہتا ہے' اس نے ہر چیز کے لیے ایک انداز مقرر کر دیا ہے۔" (الطلاق 2-3)

اوپر کی تفصیلوں سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے' اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں' اس لیے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے "خدا اعتمادی" کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔

☆☆☆☆☆

صبر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف 35)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو برتو پردے ڈال رکھے ہیں' وہ اُن کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں' لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی

''صبر'' کے لغوی معنی روکنے ''سہارنے'' کے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا۔ اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے) یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی' دل کی مضبوطی' اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔

صبر کے مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے' حسب ذیل ہیں۔

(1) وقت مناسب کا انتظار کرنا

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا آنحضرت ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی۔ تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ ﷺ کی مخالفت میں سرگرم جولان

ہوگیا' ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں' تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ ﷺ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی۔ اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں' آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہے خدا آپ کا نگہبان ہے' خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا:

(2) بے قرار نہ ہونا

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بیقراری نہ ہو' بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرماوے گا۔

(3) مشکلات کو خاطر میں نہ لانا

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں' دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں' اور مخالفین جو طعن وطنز کریں' ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو' بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کیساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

(4) درگذر کرنا

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظرانداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے' اس کے قصور کو معاف کیا جائے' یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔

(5) ثابت قدمی

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے' قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم پر بار ہا

استعمال کیا ہے' اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے' صادق القول اور راست باز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا۔

(6) ضبط نفس

اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں' اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے مگر یہی ضبط نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی' متانت' وقار اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

(7) ہر طرح کی تکلیف اُٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی میں بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے مذہبی فرائض واحکام کو جو بہرحال نفس پر سخت گزرتے ہیں' عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے۔ ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرماں برداری' اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے۔

☆☆☆☆☆

شکر

وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (الاعراف 144)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ "جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تر و تازگی پوری ہو اور دودھ زیادہ دے" اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے۔

یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہوسکتی ہے دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو زبان سے اُس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اُس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے' اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹا کفر ہے' اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اُس کے اقرار اور عمل سے اُس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں' اسی سے ہماری زبان میں کفرانِ نعمت کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی بڑا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں ہے اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا۔ زبان سے اُن کا اقرار اور عمل سے اپنی طاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا' کفر ہے جس کے

مرتکب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے۔

شکر ایمان کی جڑ' دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر وعظمت اور محبت پیدا ہونی چاہیے اور اسی قدر وعظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کر نام شکر ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے شکر اور ایمان۔ ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے' ساری عبادتیں شکر ہیں' بندوں کے ساتھ حسن وسلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے' دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے' تو یہ دولت کی شکر ہے' صاحب علم اپنے بندگان الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے' طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لیے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل وکرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے' حالانکہ ان کے لیے نہ کوئی ہمارا خدائی استحقاق تھا نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی۔ جو کچھ ملا اُس کے فضل وکرم سے ملا' اور جو کچھ ملے گا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی' انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں۔ دیکھ کر۔ اور ان کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں' بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے جس کے شکر یہ کی کوئی ضرورت نہیں' مگر خوب سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحادکی کونپلیں نکلتی ہیں' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے' تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے۔

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا' تو مالک کا شکر ادا ہوگیا' حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے' شکر دراصل دل کے

اس لطیف احساس کا نام ہے جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں' ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لیے سراپا سپاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں' اور اس کی فرمایشوں کو پورا کرتے رہے' اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں۔ لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو' اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو' تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں' اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان ؑ کو اپنے پے درپے احسانات سے جس طرح نوازا' اس کے بیان کرنے کے بعد کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (سبا 13)

(اے داؤد کے گھر والو' شکر ادا کرنے کے لئے نیک عمل کرو۔)

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو' بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے لیے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو' وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا ' اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کرے گا' اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کرے گا ' بلکہ آنحضرت نے خود آپس میں ایک دوسرے انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری کا معیار فرمایا ہے' ارشاد ہوا مَنْ لَّا یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرِ اللّٰہَ (ترمذی کتاب البر والصلۃ) یعنی جو انسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا ' وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا' اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

☆☆☆☆☆

سیرت النبی ﷺ

جلد ششم (6)

(اخلاقیات)

تعلیماتِ نبوی ﷺ کا تیسرا باب

اَخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبوی ﷺ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے۔ اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے۔

انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز و رشتہ دار، دوست و احباب، سب سے تعلقات ہیں بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلّہ، وطن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں، اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و ایمان اسی اخلاق کی بدولت ہے، اسی کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو، اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے

والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دے۔ دنیا کے سارے مذہبوں نے کم وبیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب "اسلام" نے بھی یہی کیا ہے۔ آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے۔ اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

☆☆☆☆☆

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے' سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے' انصاف بھلائی اور ظلم بُرائی ہے' خیرات نیکی اور چوری بدی ہے لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور ایمان

ایمان جو کو مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کرسکتا ہے اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاقِ حسنہ کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہل ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے۔ فرمایا:

"بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع وخشوع کرتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔" (المومنون 1 تا 9)

ان آیتوں میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے' ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام میں

اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے' وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز میں جو دعا مانگتے تھے' اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا۔

"اور اے میرے خدا! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی راہنمائی کر تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا' لیکن تو۔" (صحیح مسلم)

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے وہ حسن اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے۔ فرمایا:

اكمل المومنين ايماناً احسنهم خلقاً.

(مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔)

یہ حدیث ترمذی' ابن حنبل' ابو داؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسن اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں' ایک رات بھر نماز پڑھتیں' دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں۔ مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کیے رکھتی تھیں۔ دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں' اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ

اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز

ایک کامل ومکمل اور آخری معلم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر اترنا ضروری ہے۔

1۔ اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔
2۔ اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔
3۔ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اِتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی

تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام ؑ کی حیات پاک کے برابر جامع کمالات نہیں' دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانی مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے۔

تو راۃ کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں' ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو توراۃ کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے۔ حضرت نوح ؑ سے لے کر حضرت موسیٰ ؑ تک توراۃ کے ایک

ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ۔ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پوری شبیہ دنیا کے سامنے موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ کی تینتیس برس کی زندگی سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات وخوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے' ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ان انبیاء ؑ کے علاوہ ہندوستان' ایران' اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اسلام ہی کے ایک معلم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کہ "یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جن میں محمد ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے" آنحضرت ﷺ کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ' محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو' اس کو جلوت میں برملا بیان کر۔ جو حجرہ میں کہتے سنو اس کی چھتوں پر چڑھ کر پکارو' الا فلیبلغ الشاھد الغائب.

قول کے ساتھ عمل

اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے' ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی' اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ ونصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہ زیتون کے پُر تاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ) کی معصومانہ باتیں' سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع وبدائع اور دل کش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام ودہن میں ہے۔ مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم وعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس

نے یہ کہا کہ ''سب کچھ جو تمہارے پاس ہے جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹانہ دو' آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا۔ وہ جس نے یہ کہا کہ ''شریروں کا مقابلہ نہ کرو۔'' کیا اس نے خود بھی پیار کیا ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''دشمنوں کو بھی پیار کرو'' کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''اگر تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر'' کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ '' اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔'' کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ ''تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو۔ کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح ؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے' اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے اس کو کر کے دکھایا۔

ایک شخص نے آکر ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کہ تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ'' جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حال قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا۔ اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا' خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا' اگر آپ اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا' کھانے میں زہر دینے والوں سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا' جنہوں نے آپ ﷺ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں' مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت بھی جس نے آپ ﷺ سے کپڑا مانگا خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی۔ سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں۔ الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف تعلیمات اور

اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال ونصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں' دنیا کے کسی پیغمبر اور ربانی دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے ہم عصروں کے سامنے پیش نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول ﷺ کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف وخطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد وتبصرہ کے لیے پیش کیا' فرمایا:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖٓ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس 16)

(اے منکرو) میں تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں' کیا تم نہیں سمجھتے۔

پھر آپ ﷺ کو خطاب کر کے خود آپ ﷺ سے فرمایا۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم 4)

(اے محمد) بے شک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل ومکمل

اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے' یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو۔ وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھوکر پاک وصاف کر دیتا ہو۔ اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے' کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اُتر سکے۔ یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (الجمعہ 2)

(وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو

کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔)

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض اثر سے پاک وصاف و مصفی بنا بھی دیتا ہے۔ وہ ناقصوں کو کامل' گنہگاروں کو نیک' اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن بنا دیتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا' کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے ہیں۔ اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا' تیئس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیم اخلاقی کا تنوع

اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو' پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم ونسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے' اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں' حضرت موسیٰ ؑ کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں۔ حضرت عیسیٰ ؑ کے مکتب میں عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں' بودھ کے وہار اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا اور کوئی موجود نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ کی درسگاہ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی ہر وقت نشوونما پارہی ہے۔ خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے۔ جس کے اندر علم وفن کا شعبہ اپنی جگہ قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان' ایک باپ' ایک شوہر' ایک دوست' ایک خانہ دار' ایک کاروباری تاجر' ایک افسر' ایک قاضی' ایک سپہ سالار' ایک بادشاہ' ایک استاذ' ایک واعظ

'ایک مرشد' ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آ کر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔ اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپ ﷺ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ مدینۃ النبی ﷺ کی درس گاہِ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے۔ اور جس کا نام مسجد نبوی تھا۔ اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں۔ کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، جیسے فرماں روا زیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ وزبیرؓ و معاویہؓ و سعد بن معاذؓ و سعدؓ بن زبیرؓ جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں' کہیں خالدؓ، ابوعبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاصؓ اور عمرؓ و العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے۔ کہیں ان زہاد وعباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں۔ کہیں ابوذرؓ و سلمان و ابودرداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو مسیح اسلام کہلاتے تھے' کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لا کر بیچتے اور گذارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے۔ کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا۔ ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے۔ کہیں غریبوں کی نشست ہے' اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے۔ مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی' سب مساوات کی ایک ہی سطح پر' اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں۔ سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا مآخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو لیکن اسلام اس کے اس ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے۔ تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کر دے۔

فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں' ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا مآخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی مآخذ اور محرکات' ضمیر فطرت' وجدان اور عقل سب ہوں۔ اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کے ساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو۔ اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد' خدا کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے' ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے' ساتھ

ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہو سکتے ہیں جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات، اور وجدان کا ایک حکم ہوا اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو' اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے' اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے۔ اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے' وجدان کہیے' حاسۂ اخلاقی کہیے' ضمیر کہیے' اس فلسفیانہ تشکیک سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر مبنی سمجھتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا' خصوصیات' زبان' مذہب' رسم و رواج' طرزِ حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلادلیل متفق اور متحد ہیں۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں۔ اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات' مسموعات اور ملموسات وغیرہ کیلئے ہمارے اندر باصرہ' سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح' خوبصورتی اور بدصورتی کا' یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا بُرا' عملی حیثیت سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدی ﷺ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرح کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے ہیں مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ ان کے عمل میں ہے۔ اس لیے "علم بلاعمل" کی کوئی

قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے۔ اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کیے ہیں مگر اخلاق کے باب میں اس کی عالمانہ تحقیق کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں' وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں' انھی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر' وجدان' اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہیے ہونا چاہیے۔ ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی' اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

بے غرضی

چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لیے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی' نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے' اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں' اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی۔

فرض کیجیے' میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوہ تھا، وہ راستہ میں گر گیا، جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوہ پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا' تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا۔ لیکن فرض کیجیے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوہ مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے۔ راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے' اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی۔ یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ

اس کی بیوی ہے حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے۔

نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ بھی فخر' نمائش' ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا۔

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت' یعنی قلب کے عمل پر ہے۔ تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے۔ ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں' اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں' تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں' دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے۔ پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے اچھے اعمال ارادہ سے وجود قطعی محال ہے۔ اسی لیے وحی محمدی ﷺ نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا' ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بغیر اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے۔

ضمیر کی آواز

یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے۔ غریب ولاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے۔ قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے۔ یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کا ضمیر ہے۔ ہر اچھے یا برے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے۔ لیکن بری صحبت، بری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر

سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں' یہ اس کے نتائج ہیں۔

☆☆☆☆☆

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

اسلام کو جو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے' اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل' ہمہ گیری اور انضباط ہے۔ یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہوگیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہوگئے ہیں۔ اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا اُم الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی۔ اس بناء پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہوگیا' صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل و اسباب اور عواقب و نتائج کی تحدید کی' اور ان کا کلی استیصال کیا' شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا۔ اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بت توڑ دیے جاتے لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کرسکتی تھیں؛ تصویر بجائے خود کوئی بری چیز نہ تھی تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی' اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ کسی کی مدح میں غلو اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہوجاتا ہے' اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہوسکتا ہے۔ اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لیے اس سے کام لے سکتا تھا' تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے جس نے امم

قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس لیے اسے منع کر دیا۔

آنحضرت نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے۔

1۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

2۔ ہر بُرائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

3۔ نرمی و گرمی' عاجزی و بلند ہمتی' دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ

یہودی و عیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی فہرست پر ایک سرسری نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنا لی گئی ہے اور ان میں سے صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست

سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو و درگذر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا۔ سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی، امانت داری، وعدہ کا ایفاء کرنا۔ عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ کرنا، صدقہ اور خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو بُرا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ بُرے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا۔ حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد و اتفاق،

ایمانی برادری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بُری بات سے روکنا، اولاد کشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال وجائداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا۔ کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی برائی، آنکھ، کان اور دل کی باز پرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت وعہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو بُرا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل و انصاف، دشمنوں تک سے عدل وانصاف، صدقہ و خیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی برائی۔ اُلاہنے کی مذمت، فسق و فجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی، اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقویٰ اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی برائی، رفتار میں وقار و متانت، مجالس میں حسن اخلاق، ضعیفوں، کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم و جان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرمگاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا۔ بدگمانی نہ کرنا، ثابت قدم، استقلال اور شجاعت و بہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی برائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کے بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال و دولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست

یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآن پاک ہے۔ ان کے علاوہ اسلام کی

اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت ﷺ کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر اور تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں۔ ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ آنحضرت کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کی بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہے جن میں سے ہر ایک صفحہ میں ۳۷ سطر میں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں' ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں۔ تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات وحالات کا کوئی ایسا جز نہ ہوگا جو داعیٔ اسلام علیہ السلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو۔ اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ ہم ذیل میں آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔

صلہ رحمی' ماں باپ کے ساتھ سلوک' بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل وعیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجتمندوں کی امداد، اندھوں کی دستگیری، عام انسان کے ساتھ ہمدردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت وعیادت، رشک وحسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومت عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم وحیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو و درگذر، صبر وتحمل، حسب ونسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہونا۔ دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق ونرمی، قناعت و استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا،

چغلخوری کی ممانعت،تہمت لگانے کی برائی ،غیبت کی ممانعت، بغض وکینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع و خاکساری، امانت داری ، گالی کی ممانعت ، منہ پر مدح وستائش کی ممانعت،لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت،فضول گوئی کی ممانعت،فضول خرچی کی ممانعت ، کبر وغرور کی مذمت،ہنسی مذاق کی برائی،نفس انسانی کا احترام،ظلم کی ممانعت ، عدل و انصاف،تعصب کی ممانعت،سخت گیری کی ممانعت، غم خواری وغمگساری،توکل ، لالچ کی برائی ،رضا بالقضاء، ماتم کی ممانعت ، قمار بازی کی ممانعت ،سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت،جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا،ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے۔ منافقت اور دو رخی ، چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت ، خیانت اور فریب کی ممانعت ،شراب خوری، زناکاری اور چوری کی ممانعت،طہارت وصفائی، دوست و احباب کی ملاقات سلام وتحیت ،مصافحہ و معانقہ، دیگر آداب ملاقات ،آداب مجلس، آداب طعام ،آداب لباس، آداب نشست و برخاست ، خانہ داری کے آداب،سونے جاگنے کے آداب ،عورتوں کے متعلق خاص آداب واخلاق وسلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہوسکے گا کہ آنحضرت ﷺ کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں۔ ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ حقوق، فضائل و رذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ اُن کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجا لانا ہے اس کو آداب کہتے ہیں مثلاً اُٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور وطریق، ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

حقوق وفرائض

حقوق کی ترتیب

مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو تو راۃ انجیل کی طرح مختصریوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن صرف محبت کرنا" کہہ دینا کافی نہیں' بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے۔ جو اس محبت کا تقاضا ہے اور اس کے مظاہر ہیں' یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کارنامہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا"ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو۔" اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جوانسان اپنے جسم وجان اور مال وملکیت کے چاہتا اور پسند کرتا ہے، وہی دوسروں کے لیے چاہتا اور پسند کرتا تو راۃ وانجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرعنوان ہے' لیکن اسلام میں یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے' جن کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی، دوری نزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں

ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ،مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے، کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے ۔ مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے ، اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی، اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پا سکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابتداروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برترانہ حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا، لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب بیمار بھائی ہے ۔ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے ۔ پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے، تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے ،ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی کے ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے ، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے۔ یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ

اپنے اوپر مزید مزاحمت گوارا کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا۔

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں۔

والدین کے حقوق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے۔

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو" (خروج ۲۰۔۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

"تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے"۔(احبار ۱۹۔۳)

اجتہاد یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

"اور جو کوئی اپنے باپ ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا" اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے"۔(احبار ۲۰۔۹)

"اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا" (خروج ۲۱۔۷)

حضرت عیسیٰ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان حکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے۔ پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی

نذر ہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں،
پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔ (متی ۱۰-۴)

نبوت محمدی جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے اس نے تورات وانجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

1۔ اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، او ربتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے۔ عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی، اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

"اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی۔ اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا۔ اور دو برس تک دودھ پلایا۔" (لقمان 14)

"اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا۔ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔" (احقاف 15)

آنحضرت ﷺ نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں! اس نے عرض کی، پھر کون، فرمایا تیری ماں، تین دفعہ آپ ﷺ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی

ہے۔ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی یارسول اللہ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں! دریافت کیا خالہ ہے؟ گذارش کی، ہے، فرمایا تو اس پر نیکی کر" یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ ﷺ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا، فرمایا کہ تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے"۔

2۔ ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی، بچہ کی تولید وتکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی دماغی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتے ہیں تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے' چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی "عزت" کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت، ان کی اطاعت، ان کی امداد اور ان کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے۔ اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو اس کی خدمت گذاری کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا، اسی لیے ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گزاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی

نے آکر خدمت اقدس میں شرکت جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں، عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔

اولاد کا حق

اصول تعلیم

جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جو مذہب لے کر تشریف لائے اس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں' وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت ﷺ نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتادیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے ان حقوق کی جس طرح تشریح کی جائے یہ متن ان سب پر محیط فرمایا:

> جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ (ترمذی)

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں، یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں، بڑوں افسروں، ماتحتوں، آقاؤں، نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں

میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں ، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشو ونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں؛ یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اِسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے، اور ذریعہ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

رضاعت وحضانت

اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشو ونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہوجائے اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے ، چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے۔

تعلیم وتربیت

ظاہری اور جسمانی نشو ونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے' قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل وتشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں ،فرمایا:

> ''اے ایمان والو، تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔'' (التحریم 6)

اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچانا بزرگ خاندان کا فرض ہے ، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود اُن کی تمام برائیوں ،خرابیوں اور ہلاکتوں سے اُن کی حفاظت

ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنادیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد ہے۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے، ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو، اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے، اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اُسے جنت میں داخل فرمائے گا

باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعت محمدی ﷺ میں قائم نہیں، اسی لیے دُنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں، کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت ﷺ نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا۔

ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت ﷺ کی شہادت ہو، انہوں نے خدمت اقدس میں حاضر ہوکر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہیں، فرمایا تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا۔

اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اُس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کردی گئی، اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا، اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اُس کا خاتمہ ہوا۔

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن و شو کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا، اسی

طرح حقوق زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کے لیے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا، اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہوسکتی ہے۔ اس سے بدر جہازیادہ تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حسن سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو، اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہوسکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے۔ مذہبی تجرد کی پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا ہے۔

نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے چنانچہ زن و شوہر کے باہمی اخلاص و محبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں ایک قرار دیا ہے فرمایا:

> ”اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں۔“ (الروم 21)

قرآن پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے، اس کا خلوت خانہ عالم کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے طلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لیے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہیے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے خدا نے اس تعلق کو اپنے عجیب و غریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار مہر و محبت اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن و شوہر باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

> "مرد عورتوں کے سردھرے ہیں اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تو نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے ان کی حفاظت کی ہے۔" (النساء 34)

آیت کے آخیر حصہ کا مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلاف فطرت ہے۔

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے کے

ساتھ لازم وملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوشی، ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلاغت دیکھیے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے۔

"عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کو پوشاک ہو۔" (البقرہ 187)

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لیے۔ تم ان کی زینت ہو، تمہاری وہ، تم ان کی خوبصورتی ہو، وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری، یہی نکاح کے اغراض ہیں، اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوق زوجین کو ادا کرنا ہے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:

"تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر کے مال ودولت اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔" (النساء 34)

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں۔ ان کے مال ودولت اور ملکیت کی حفاظت ان کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت اور آبرو کی جو خود ان کی عزت وآبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت وعفت ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے۔ شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کردے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کردے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے۔" (ابن ماجہ، نکاح)

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدرومنزلت نہ تھی' وہ ہر وقت معمولی معمولی باتوں اور قصوروں پر ماری پیٹی جاسکتی تھیں' حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا' پھر وہ کہتے ہیں کہ "ہم

لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار وقطار میں نہیں سمجھتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کیے۔"

اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اس لیے اسی کو صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر نان ونفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے ہتاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات، کی خوشگواری قائم رہے۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی۔ خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتوں کا بارگراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایا بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان ونفقہ، اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے۔ اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے۔ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

☆☆☆☆☆

اہل قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن وشوہر کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہل قرابت کا حق ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام صلہ رحم ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ وحی محمدی ﷺ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن پاک میں کم ازکم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے۔ اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الروم 38)

(تو قرابت دار کو حق ادا کرو۔)

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں۔

"اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا، اور رشتوں کا خیال رکھو۔" (النساء آیت 1)

اس آیت پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے آکر عرض کی یا رسول اللہ! مجھے ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا خدا کی بندگی کرو۔ کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ۔ نماز پوری ادا کرو۔ زکوۃ دو۔ اور قرابت کا حق (صلہ رحم) ادا کرو۔

جبیرؓ بن مطعم صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو صلہ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس

وقت تک رکا رہے گا۔ جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا۔)

ابو ہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ "جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔"

اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال ودولت میں فراخی اور عمر میں زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ صلہ رحمی کی دوہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے۔ دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔ اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جاسکتی ہے۔ انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال ،تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ، صلہ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمانیت خاطر رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے۔

ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے" صلہ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلہ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلہ رحم کا جواب صلہ رحم سے دے۔ بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلہ رحم کیا جائے۔ یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔
انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراک عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے۔
اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے۔ اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے۔ اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اُس کی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے۔ اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے۔ ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے۔ اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو۔ اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔
ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک دوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے۔ تاکہ برائیوں کا سدباب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے جنت کا نمونہ ہو۔ اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنالی ہیں۔

عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے۔ بلکہ وہ عزت وافتخار کا موجب تھے۔ اگر کسی پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا۔ اور اس لیے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا۔ اسلام نے آ کر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔ وحی محمدی ﷺ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے۔ جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے۔ مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے۔ ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے۔ جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم مذہبی، یا کوئی اور دوہرا تعلق بھی ہو۔ قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے۔ ارشاد ہے۔

"اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کیساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)۔" (النساء 36)

اس "قریب اور بیگانہ" کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ "قریب" کے معنی رشتہ دار وعزیز اور بیگانہ کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں دوسرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور "دور" سے مطلب دوسرے مذہب والے ہیں۔ جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ۔ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے، تعلیم محمدی ﷺ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسائیوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو۔ وہ خواہ قرابت اور عزیز داری ہو یا ہم مذہبی ہو۔ یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو۔ بہر حال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ ﷺ نے اس کو ایمان کا براہِ راست اثر اور نتیجہ فرمایا۔ ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ ﷺ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دل نشین انداز سے فرمایا" خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔" جان نثاروں نے پوچھا" کون یا رسول اللہ!" فرمایا وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں۔" ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا" جو شخص خدا اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے۔"

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا۔ ارشاد فرمایا" خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھیوں میں بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے۔ جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے۔" ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں ان کو وراثت کا حق نہ دلادیں۔" حقیقت میں یہ ارشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی، اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ آنحضرت خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔

☆☆☆☆☆

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوش محبت میں لے اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے، اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے۔ عقل وشعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔

عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی۔ مگر جیسا کہ چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے۔ کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم وشفقت کا جذبہ تھا قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے۔

کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ (الماعون 1-2)

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کو متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

"نہیں یہ بات نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا

سمیٹ کر جھا جاتے ہو اور دُنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر ریجھے ہو۔" (الفجر 17 تا 20)

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کیساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے، کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔" (استثنا ۱۴۔۲۹،۲۶۔۲۱) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے۔ اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم، دین کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا۔

وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا۔

"کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا، تو اس نے پناہ دی...... تو یتیم پر سختی نہ کر۔" (الضحیٰ 6-9)

آنحضرت جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے، یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بے کس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے امت کے سرپرست ﷺ نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل ہوں۔ خود اپنے برابر جگہ دی۔ فرمایا۔

"میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والے جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔"

یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا۔ بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو۔

نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانوں کا سب سے اچھا گھروہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے۔ اور سب سے بدتر گھروہ ہے جس میں کسی یتیم

کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔"

آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی۔ وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے، وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے۔ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے۔ اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کے لیے اپنے آغوش محبت کو پیش کرنے لگا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان اور انصار وغیرہ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جاکر دل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے، کیا محمد رسول اللہ سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے اس مظلوم فرقہ کی داد رسی کی۔ عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی۔ اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں۔ ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے۔ ان کے وظیفے مقرر کیے۔ مکتب قائم کیے۔ جائدادیں وقف کیں اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی اور قانونا اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ یتیموں کے سرپرست ہوں۔ ان کی جائدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں۔ اور یہ وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے۔ اور لندن کے لارڈ میریا آفس کورٹ کے حکام مسلمانوں قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

بیوہ کے ساتھ حسن سلوک

یتیموں کے بعد اصناف انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنس کے ان افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کردیا ہے۔ اب وہ بے یارومددگار، اور بے مونس وغمخوار ہیں۔ نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ ان کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے۔عورت جس کو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا۔ اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالے کردی تھی۔ اب وہ ناچار اُن سے دوچار ہے۔ اب غم والم اور فکر وتردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر، نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے، بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس وپیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔دنیا کے روز مرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہوجاتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کرسکتا تھا۔عورت کی مرضی کو اس زن وشوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا۔عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کرسکا ۔ ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی ۔اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہیے۔ اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہوکر ساری عمر سوگ میں گزار دے۔عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے

وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے۔ اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے۔ اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی دل داری ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور اسے اتنی مدت تک کے لیے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل نہیں۔ اس کے لیے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی اور اس کا نام عدت رکھا، یعنی شمار کے دن۔ اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دے دی۔ اس کا دین مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اول ضروری ٹھہرایا۔ پس اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا۔ عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی، اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کر دیا اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔

اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے۔ اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے۔ اور کسی شریف شریک زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ وہ محروم ہو گئی ہے۔ وہ اس کو پھر عطا کیا جائے۔ قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو صریحا یہ حکم دیا۔

اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔ (النور 32)

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے

آپ ﷺ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ عمر بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اس طرح اس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثناء میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کیے جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینبؓ، ام المساکینؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ، حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ، بیوہ تھیں۔ جن کی کفالت کا بار آپ ﷺ نے اپنے دوش مبارک پر اُٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بتادیا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

السّاعي عَلى الْارملة والمسكين كا لمجاهد في سبيل اللّٰهِ و كالذى يصوم النهارويقوم الليل (كتاب الادب)

بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا، خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے۔ اور اس کے برابر ہے۔ جو دن بھر روز اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں۔ لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں۔ جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہوجائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہوجائیں۔ یہ فرمایا' میں، اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑجانوالی بیوہ قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہوجائے۔

☆☆☆☆☆

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحب دولت اور بے نیاز ہو، کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجتمندوں کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو۔ یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے۔ اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو۔ بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو۔ اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔ مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو۔

حاجت مندوں کی حاجت برآری ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا۔ ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے۔ آنحضرت ﷺ نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

"جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا۔ تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا۔ اور جو مسلمان کسی

مسلمان کی مصیبت کو دور کرے گا۔ تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔" (بخاری و مسلم)

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ ﷺ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بے کس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔ یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلنے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے بیماروں اور مریضوں کا ہے ۔ یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے۔ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال ، خدمت ، غمخواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں عیادت ہے۔ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے۔ان کو یک قلم معاف یا ختم کر دیا ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنادیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے ۔ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہوجائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کے لیے وہ اس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں۔اور وہ پاک وصاف ہوجاتا ہے۔

آنحضرت نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ اس کے آداب تعلیم کیے ہیں ۔ اس کی دعائیں سکھائی ہیں۔ اور اس کا ثواب بتایا ہے۔

فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا۔ خدا اس کے غم کو ہلکا کرے گا۔

یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔ جن میں

ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اس کی عیادت کرے۔

صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا۔ جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے۔ ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو فرشتے شام تک اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں۔ یہ بھی آتا ہے کہ "جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے۔ فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلی اور دلاسا دیوے۔ اور اس کو شفا پانے کے لیے خدا سے دعا کرے۔

آنحضرت ﷺ اور آپ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہ تھی۔ آپ ﷺ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے۔ منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں۔ اور اسی سے علماء نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تاکہ بار بار ان کی عیادت کی جاسکے۔ رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں۔ جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ ان کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں۔ غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بی بیاں فوج کیساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی تھیں۔

آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ "بھوکے کو کھلاؤ۔ قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو۔"

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل موثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ

"قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ" اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو

میری عیادت تو نے نہ کی۔" وہ کہے گا اے میرے پروردگار تو سارے جہاں کا پروردگار ہے میں تیری عیادت کیونکر کرتا۔ اللہ فرمائے گا" کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔" تعلیم کی یہ طرز ادا بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غمخواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے اور صابرو شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ان بیماروں کی خدمت کر کے خدا کا قرب پاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹورانوں نے اپنے سر لے لی ہے۔ مگر گذشتہ نظامِ تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی وقت کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے۔ آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل وہ ہمارے ساتھ کرے گا۔

گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کیساتھ نہیں، لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھایا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے۔

> ”(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے کہ جب (یہ لوگ) ان کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا (اور دل میں کہا کہ یہ لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں۔ پھر جلدی سے اپنے گھر جا (ایک) موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر

مہمانوں کے لیے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے تامل کیا (ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکا کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔" (الذاریات 24 تا 28)

اس حکایت سے آداب مہمان داری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جاسکتے ہیں۔

(۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتداء باہمی سلام سے ہونا چاہیے۔

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے کیونکہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہیں۔

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں۔اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے لیے کچھ سامان کیا جارہا ہے۔ تو وہ ازراہ تکلف اس کو روکیں گے۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ اپنے اہل وعیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

(۴) کسی بہانے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہوجانا چاہیے تاکہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہوگئے۔

(۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے۔اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔

(٦) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا

چاہیے۔اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے۔ یہ نہیں کہا کہ لوگ کھایئے۔

(۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے تاکہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل وعیال کے کام آئے۔ اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم نے اس کو ناپسند کیا۔ اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہو کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے۔ اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہم لوگ کھاپی نہیں سکتے بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لیے آئے ہیں۔

سورہ حجر میں حضرت لوطؑ کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام وآسائش کے ساتھ میزبان ، مہمان کی عزت وآبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے۔اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے کہا

"یہ میرے مہمان ہیں۔ تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو۔ اور خدا سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔" (الحجر 68-69)

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے لیکن رسول اللہ نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمان کامل کا ایک جزو قرار دیا۔ اور

جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کیساتھ دے۔" کہا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس کا جائزہ ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے۔ اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا۔"

☆☆☆☆☆

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا۔ ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے۔ اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہروقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

آنحضرتؐ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے۔ اور وہ دین کا رشتہ تھا۔ جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملادیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنادیا اور خاندانی و قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کردی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کردیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلادیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے:

''مسلمان کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے، اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔''

صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا'' سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد

ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔"

مقصود یہ ہے کہ امت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں، اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان باہم ایک دوسرے سے مل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔"

بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے۔

اس تمثیل میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مل کر مضبوط ہو کر ناقابل تسخیر حصن و حصار بن جاتی ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مسلمان ہے۔ یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے۔ انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔" یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔

ابو داؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے۔ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ میں قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔"

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ ﷺ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا۔ پھر فرمایا۔

"دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو"

ایک اور موقع پر فرمایا کہ "جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اُٹھائے وہ ہم میں سے نہیں" جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا "سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔" اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو۔ جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا "جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسی موقع پر بے مدد چھوڑ دے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہے اور اس کی آبرو جاتی ہو۔ تو خدا اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضگی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت ﷺ نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے۔ ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے، اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتداء کرے۔

ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، آپس میں کینہ نہ رکھو۔ حسد نہ کرو۔ اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہو، اے خدا کے بندو، بھائی بھائی ہو جاؤ، اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے۔

دیکھئے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں۔ ہر جماعت انہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے۔ اور آئندہ بھی بنے گی۔

☆☆☆☆☆

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ 83)

(اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔)

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا ، انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں ، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے۔

ہر قسم کا بُرا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کیلئے آمادہ رہتا ہے، مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم زمین والوں پر رحم کرو۔ تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔

یہ حدیث رحمۃ للعالمین ﷺ کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کیساتھ ظاہر کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف ومحبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی۔

اہل عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں کو کہتے تھے کہ تم ان کو کھاجاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے۔دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہوجاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلاجاتا تھا۔ جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہوجاتے تھے۔ یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی۔ان واقعات کاذکر اشعار عرب میں موجود ہے۔

ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کرمرجاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے۔اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹادیا۔ عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کراس پر نشانہ لگاتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس قسم کے گوشت کو ناجائز قرار دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ بنایا جائے ، ایک بارایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کانشانہ بنارہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا۔ اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کراس کے خاندان میں آئے اورکہاکہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو۔ کیونکہ رسول ﷺ نے اس طریقہ سے جانور یا کسی اور جاندار کونشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔

بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا۔ جو جانور ضرورتاً مارے یا ذبح کئے جاتے ہیں،اُن کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہرطرح نرمی کرنے کا

حکم دیا۔ جانوروں کیساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں۔ ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذارسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذارسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔ اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجب ثواب ہے۔ اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں۔ ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں اگر میں ان کو پانی پلادوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ذی حیات کیساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے، یعنی

(1) جو جانور جس کام کیلئے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہیے۔

(2) جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ، تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے، ایک بار آپ ﷺ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو، اور اُن کو کھاؤ تو اُن کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔

(3) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔

(4) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہوکر تکلیف پاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فضائل اخلاق

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ برا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گو یہ دوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی برائیاں اور خلق خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے۔

اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں ! وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے رذائل۔ میں ہم نے اوپر اخلاق اور محبت الٰہی کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے ان کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے۔ یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں جا بجا ان کی تصریح ہے لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو، اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتاب الٰہی اور پیام نبوی میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے بندوں کی توصیف کی ہے، یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشائش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں جابجا ان کی تفصیل ہے۔

فضائل اخلاق کی سرسری فہرست

صدق (سچائی)، سخاوت، عفت و پاک بازی، دیانتداری اور امانت، شرم وحیا، رحم دلی، عدل وانصاف، عہد کی پابندی، احسان، عفوو درگذر، حلم و بردباری، رفق و لطف، تواضع وانکساری، خوش کلامی، ایثار، اعتدال اور میانہ روی، خودداری یا عزت نفس، شجاعت اور بہادری، استقامت، حق گوئی، استغنا وغیرہ۔

☆☆☆☆☆

رذائل

رذائل کے معنی

رذائل (یعنی بری خصلتیں) وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہوجاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہوجاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود، اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہوجاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام

اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر ان کو مُنکَر (بری باتیں) اور فحشاء (بے حیائی) اور کبھی فَاحِشَة (برا) سُوْء (برائی) مَکْرُوْہ (ناپسندیدہ) خطأ (ناصواب یا بھول) اِثم (گناہ) عُدْوَان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے، ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھناؤنا اور نفرت کے قابل ہے، اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں۔

رذائل کے لیے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ منکر ہے، چنانچہ وہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں کی روک تھام نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی

لفظ منکر سے ادا کیا گیا ہے:

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

(المائدہ آیت 79)

(وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔)

☆☆☆☆☆

رذائل پر مختصر تبصرہ

اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ان ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدم صدق ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، خلاف وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دو رُخا پن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔

دوسری اساسی برائی حب مال ہے اس سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے بخالت، حرص وطمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں۔

تیسری اساسی برائی حب ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے، حسد، تکبر، عجب، فخاری، غیظ وغضب، ظلم، کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کر لے گا۔ یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنت میں آرام پائے گا۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ (النازعات 40-41)

(اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا تو جنت اس کی آرام گاہ ہے۔)

☆☆☆☆☆

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے علاوہ وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جز ہیں، آداب، کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی وعدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے ان کے آداب میں خوبی اور لطافت ملحوظ رکھنا حسن ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے، اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہوجائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام نے اپنی عملی وقولی ہدایت سے مسلمانوں کے لیے اس کا بہترین نمونہ قائم کردیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ ہے اور اپنے آداب وقواعد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب وآئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اس کے آداب وقواعد کا ماخذ بھی ہے، اسی لیے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنادیتا ہے۔

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح و سنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری و مسلم، ترمذی اور ابو داؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فطری آداب

اسلام دین فطرت ہے اس لیے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے، یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں، حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا، ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا، یعنی ستر عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں۔ ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جبکہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کو جسمانی طہارت ونظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصال فطرت کہتے ہیں امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خصال فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرنا، موئے زیر ناف اور بغل

کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھیں ترشوانا ، ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں ، مونچھ ترشوانا ، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا ، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا ،بغل کے بال بنوانا، موئے زیر ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا ، راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا غالباً کلی کرنا ہوگی۔

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا ،واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا، بال بنوانا،مونچھیں ترشوانا،صفائی کے ضروری لوازم ہیں جن کے ناخن بڑے اورمونچھیں بڑی ہوتی ہیں وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے ، یورپ میں ناخن بڑھانا اور بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے ،مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔
مونچھوں کا بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے، یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ، حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ" ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے۔ اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے جس رنگ کی عینک لگایئے دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے۔ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لیے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے۔ مثلاً

1- آپ ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھو لے اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے، کیونکہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے، اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے، سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔

ہاتھ کی صفائی پر اس لیے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کر دے اس لیے خیال رکھنا چاہیے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

2- دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا، فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا، ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے تو فرمایا تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں، مسواک کیا کرو۔ (مسند احمد جلد 1 ص 214)

-3 عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اس لیے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

-4 ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرکے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں، ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہیے، بلکہ چاہیے کہ اس سے پانی لے کر غسل کیا جائے، کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لیے ناپاک یا قابل کراہت بلکہ عام حالت میں خود اس کی طبیعت کے لیے گھن پیدا کرے گا۔

-5 عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہوکر پیشاب نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے، اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

-6 پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہیے کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

-7 غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے خصوصاً جبکہ وہ کچی ہو، کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہوکر اڑیں گی، اور بدن کو ناپاک کریں گی، یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

-8 بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہیے، ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھولینا اچھا ہے، استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے، اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

-9 طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیے۔

-10 ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس لیے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشمینہ پوش تھے، اور محنت مزدوری کرتے تھے، ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی، جو چھپر کی تھی، ایک بار گرم دن میں رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور ہر شخص کو جو بہترین تیل میسر ہو سکے لگائے، جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی۔

11- جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے، چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، تو فرمایا کہ اس کے پاس بال ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا، جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا۔

اس کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے اس بنا پر اسلام نے بعض سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں، مثلاً یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لیے ضروری تھا کہ نہانے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو، لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر کپڑے پر نہ پڑنے پائیں، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ شدت احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ

کرتے کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔

آپ ﷺ نے حکم دیا کہ صحبت کے سوا اس سے سب کام لے سکتے ہو، اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ ﷺ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی، اور آپ کے سر کو دھوتی تھی، ایک بار آپ ﷺ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی۔ میں نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جا سکتے۔ قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے۔ اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہ نے حالت جنابت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مسلمان نجس نہیں ہوتا۔" یعنی مسلمان جنابت اور حاجت غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت اُمِ سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات پر چلتی ہوں، یعنی زمین پر گھسیٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو۔ بولیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے، یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے، ایک عورت نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو رستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے جب بارش ہو تو ہم کیا کریں، فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے، بولیں ہاں ہے، فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے، غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "زمین میرے لیے پاک کر دی گئی ہے" اور اسی لیے وہ حالت تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے، جو تا

زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام میں اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لیے جائیں، پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے، پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے، آنحضرت ﷺ ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے کہ پہلے دونوں ہاتھ دھوتے۔ پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے، پھر وضو کرتے لیکن پاؤں نہیں دھوتے۔ پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بالوں کی جڑوں کو ملتے، پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔ (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا، لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیے ہر روز نہا لے تو مباح ہے۔ آنحضرت ﷺ پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہ رہی ہو، اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟

☆☆☆☆☆

کھانے پینے کے آداب

-1 کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھولینا چاہیے، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے، لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سوکر اُٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے، اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں، اور ابو داوٗد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا، اور اس کو اس تساہلی پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کے لیے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

-2 مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہیے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے، اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے، کتنا بڑا کام ہے، یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے، اس لیے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کر لینا چاہیے۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا کہ تو جب تک

آپ ﷺ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے، لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپ ﷺ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے، اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے۔

3- انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لیے خاص کر دیے جائیں، چنانچہ سب اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لیے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے، اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں، اس لیے زیادہ تر کاموں کے لیے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہیں ہے یعنی دایاں پہلو، تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے، یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لیے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی، چستی اور طاقت ہوتی ہے، اسی لیے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے۔ صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک بار آپ ﷺ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس میں آپ ﷺ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، آپ ﷺ نے دودھ پی کر بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے۔

ایک بار آپ ﷺ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، اس نے کہا کہ میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا، مجبوراً آپ ﷺ نے پہلے اسی کو دیا۔

4- کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے بیچ سے نہیں کھانا چاہیے کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی، گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے برکت سے تعبیر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے۔

5- اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں کھانا چاہیے کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھا لے، یہ جذبۂ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دال ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے۔

6- کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے، کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے، اس لیے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے، ورنہ

چھوڑ دینا چاہیے۔

-7 سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس کو پسند فرمایا ہے، کہ دوست و احباب، یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، الگ الگ کھانا بھی جائز ہے، اور ایک ساتھ بھی، لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ برکت ہوتی ہے، اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا، کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی زیادہ کھاتا ہے سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے، پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے، فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، صحابہؓ نے کہا ہاں، فرمایا ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ پڑھ لو تو برکت ہوگی۔

-8 کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منہ کے بل لیٹ کر نہیں کھانا چاہیے، کیونکہ روحانیت کے علاوہ یہ طبی حیثیت سے اس لیے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے، کھانے کے لیے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے، یا دو زانوں بیٹھ کر، اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر کھایا جائے، یا دو زانوں بیٹھ کر، آنحضرت ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں، یعنی خاکساری سے۔

-9 کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، اِدھر اُدھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور

دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ گیا ہے تو اس کے لیے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

-10 کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پوچھنا چاہیے۔

-11 پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیے، اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے، اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے، اور اندر سے لگنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

-12 پانی کے برتن میں سانس نہیں لینا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑ جائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے، اس لیے اس سانس کو یا اس سانس کو یا اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہیے۔

-13 پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہیے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے، البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پینے سے حاصل ہوتی ہے البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

-14 پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے کیونکہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا، پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز نہیں۔

-15 کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کے رکھنا چاہیے تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے، یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔

16- کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا، اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں میں آئی ہیں، جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۝

(اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔)

☆☆☆☆☆

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو، اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہوتا کہ یہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو، ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب دکھائے ہیں۔

-1 مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی یہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے وہیں بیٹھ جانا چاہیے، یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے، اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے، صحابہ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے، انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں، جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے اسی لیے "تخطی رقاب" یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیرِ قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

-2 مجلس میں کسی کو اُٹھا کر اس کی جگہ پر نہیں بیٹھنا چاہیے، کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

-3 اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اُٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا، کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا، اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اُٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

-4 اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لیے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے اس لیے ان کا الگ کر دینا ان کے لیے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

-5 اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیے، ایسے شخص پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی ہے کیونکہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہوگا اور لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی، جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تاکہ سب کو ہنسا سکیں، اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

-6 مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے، کیونکہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی، اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈنڈا شرک سے مل جاتا ہے، اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خود داریوں اور عزتِ نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

-7 راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہیے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے، اور ہر آئند و روند کو تکنا بد اخلاقی ہے، لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا کام دینا، بری باتوں سے

روکنا اور راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا۔

-8 انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، اس لیے اپنے ہمنشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے، ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے، اسی نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں، جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے، ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے، اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، ایک مشہور مثل ہے، کہ "اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ۔" اس نکتہ کو رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے، پھر فرمایا کہ اچھے ہمنشین اور برے ہمنشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی جیسی ہے، مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا، یا اس کو خریدو گے، یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی، یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی۔

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کر فرمایا کہ "اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے، اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے، اور دوسروں کے لیے جگہ ہٹانے کے لیے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا، فرمایا:۔

"اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے کشادگی کرے گا، اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ، تو اُٹھ جاؤ، اللہ ان کے رُتبے اونچے کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔" (المجادلہ 11)

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔ منافقوں کے اس طرزِ عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے۔

إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (المجادلہ 10)

(یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دلگیر کرے ایمان والوں کو۔)

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں، وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ برا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ کہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، اس لیے ارشاد ہوا کہ تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا۔

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہیے کہ اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ قولِ نبوی ﷺ ہے۔

☆☆☆☆☆

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنا لیا۔

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

1- دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہیے۔ اسی لیے فرمایا کہ ''تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ ہے'' ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن وسلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے، چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور رغبت کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا، اور ہے۔ عرب کے لوگ ملاقات کے وقت ''اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا، وَاَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ صَبَاحًا'' کہتے تھے ''تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، تمہاری صبح خوشگوار ہو'' امرا وسلاطین کے لے دوسرے الفاظ تھے، ایرانی ''ہزار سال بزی'' ہزار برس جیو، کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو ''گڈ مارننگ'' (اچھی صبح) شام کو ''گڈ ایوننگ'' (اچھی شام) رات کو ''گڈ نائٹ'' (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے ان سب کے بجائے ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ'' کا لفظ ایجاد کیا اور اس

میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

-1 یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں وَالسَّلَامُ عَلَيَّ (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ (صٰفّٰت) ظاہر ہوتا ہے۔

-2 اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے۔ دنیوی تحصات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں، اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

-3 اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف السلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

-4 اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی، جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعد نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا کہ ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپ ﷺ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپ ﷺ کو سجدہ کیا کریں، تو آپ ﷺ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی، ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جب ہم میں کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے فرمایا "نہیں" اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے فرمایا "نہیں" اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے، فرمایا "ہاں"۔

-5 دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا و آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے۔

-6 جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے

متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پاکر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

7- اسلام نے اپنے پیروؤں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور "واچ ورڈ" مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بیگانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملت محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی:۔

"لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو، یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔"

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ:

"تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپ میں محبت نہ کرو میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ۔"

سلام کرنے کے لیے شناسا و غیر شناسا، جانے اور انجانے کی تخصیص نہیں، مرد اور عورت کی تفریق نہیں۔ بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں، البتہ اسلام نے سلام کی ابتداء کرنے کے لیے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے، اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے

کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسری یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو۔ اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیے۔

اس مصالح کے لحاظ سے آپ ﷺ نے اپنے اہل وعیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا، مجلس سے اُٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے۔ سلام میں رحمۃ اللہ و برکاتہٗ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے، چنانچہ ایک بار ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" آپ ﷺ نے فرمایا "اس کو دس نیکیاں ملیں" دوسرا آدمی آیا تو کہا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" آپ ﷺ نے فرمایا "اس کو بیس نیکیاں ملیں" تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" آپ ﷺ نے فرمایا "اس کو تیس نیکیاں ملیں۔"

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریقہ سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنیوالے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از وہی الفاظ دہرا دے چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے:۔

> وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (النساء 86)
>
> اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اس کے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو، یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

اس سے کم الفاظ کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے۔

2- ملاقات کے وقت اظہار محبت اور اظہار مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے اسلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے اس کو بھی سلام کا

ایک جزو قرار دیا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے، مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا، بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا۔

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوش محبت اور جوش عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں، حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے، اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے، اور جب آپ ﷺ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں، ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ ﷺ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لیے کھڑے ہوتے تھے، اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپ ﷺ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً کہنے مرحبا کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔

3- ملاقات یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر میں جانے کے لیے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:۔

"مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور اُن سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ لوٹ آنا، تمہارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے، اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے" (النور 27-28)

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لیے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا، اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے، تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپ ﷺ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے، ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے، تو اس پر الزام نہیں، ایک بار کسی نے آپ ﷺ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپ ﷺ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری

آنکھوں میں بچ دیتا پھر فرمایا انما جعل الاذن من قبل البصر یا فرمایا انما جعل الاستیذان من اجل البصر، یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کرکے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں۔

تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے، البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں، اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے، دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں، خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کرکے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آ گئی ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں، اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً چھوٹے بچے، یا لونڈی غلام، اس لیے اگر ان کے لیے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہوگی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے یعنی نماز عشاء کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اُتار کر سونے کا وقت ہے، اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے۔

☆☆☆☆☆

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں۔ پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو۔ اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو۔ مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو۔

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا:۔

اے ایمان والو! خدا سے تقویٰ کرو، اور بات سیدھی کہو، اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔ (الاحزاب 70-71)

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا:۔

تو (اے نبی کی بی بیو) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو، ایسا کرو گی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ خدا جانے تم سے کس طرح کے توقعات پیدا کر لے گا اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔ (الاحزاب 32)

مردوں کو نرم، معقول اور دلجوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے، فرمایا:

"نیک بات کہنی اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔" (البقرہ 263)

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا:۔

اور کچھ اپنی آواز پست کر، کہ سب آوازوں میں بری آواز گدھوں کی ہے۔ (لقمان 19)

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہو۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (المومنون 3)

(اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔)

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے۔

خدا فرماتا ہے:۔

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (ق 18)

(آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا، لیکن ایک نگران اُس پر حاضر رہتا ہے۔)

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے۔" اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور ﷺ کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے" یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے

کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لیے ملی ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں۔ پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے، اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (الفرقان 63)

(اور جب نا سمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔)

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں، اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں، اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں، یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تا قیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تا قیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے، یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رُخ صرف زبان کے سبب سے اِدھر اُدھر پھر جاتا ہے۔ یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی، اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لیے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا۔

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے تا کہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے۔ اسی غرض سے جب رسول اللہ ﷺ کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے، اور گفتگو اتنی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے، ایک بار

حضرت عائشہؓ صدیقہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابوہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی۔ حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا، حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں:۔

كَانَ كَلَام رسول الله ﷺ كلاماً فصلا يفهمه كل من سمعه.

(رسول اللہ ﷺ کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا۔)

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے۔

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہایت مسجع، مقفی، اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ ”خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو

توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے۔" نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوب کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے، خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ قبول نہ کرے گا۔"

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے تاکہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اُٹھانا چاہیے، خدا اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے:۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان 63)

(اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔)

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے، یعنی چال میں غرور تبختر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:۔

وَ لَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا. (بنی اسرائیل 37)

(اور زمین میں اکڑ کر نہ چل (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔)

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشار خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گذرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:۔

وَ لَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ. (النور 31)

اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپا لے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب و زینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آ جائے تا کہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے لونڈی نہیں، پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں۔

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیے، کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے، اور عورت کا یہ خیال برملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافت نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے عورتوں کے وسط راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہیے، ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ ﷺ نے یہ حکم دیا، اور اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ عورتیں راستہ کی اِدھر اُدھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں۔

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو۔

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لیے جوتے پہنے جائیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہن کر چلا کرو، کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے۔

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہیے، یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے، لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں۔

☆☆☆☆☆

آدابِ سفر

آنحضرت ﷺ نے جس زمانہ میں سفر فرمایا اس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لیے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب و ہوا، اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت اور مطابقت رکھتے تھے، عرب کی زمین خشک بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، لو کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت ﷺ نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے، اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضرورتِ زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

1- سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے، اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہیے جس کو رسول اللہ ﷺ فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے۔ اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَاَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيْمَ اَعْمَالِكُمْ یعنی تمہارے دین، امانت، اور خاتمۂ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

2- سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہیے، اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ پورا دن کام میں آ جاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا

ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

3- سفر تنہا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔ اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اور اسباب سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

4- اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہیے۔ اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں۔

5- سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے۔

6- اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے۔

7- سفر رات کو کرنا چاہیے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے، اور درحقیقت لو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے، بہر حال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لیے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

8- مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔

9- رات کو قیام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیے، کیونکہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہیں، اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔

10- جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آ جانا چاہیے، کیونکہ سفر بہر حال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ. (الروم 23)

(اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔)

سورۂ فرقان میں فرمایا:۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا. (الفرقان 47)

(اور اسی نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔)

سورۂ النبا میں ہے:۔

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا. (النبا 9 تا 11)

(اور ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام، اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔)

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لیے رات کا وقت ہے، اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لیے ہے، یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گذرے البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور آیت 58 میں ہے:۔ حِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ اور رات آرام میں

گذاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے۔ غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

1- سنت نبویؐ نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں، نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہیے کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے، اور نمازِ عشاء پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہیے بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہیے، یہ اس لیے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے، اور آخیر وقت میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے غشی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشاء کے بعد اس کے لیے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نمازِ عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض حاضر ہوئے ہیں اور آپ ﷺ نے بات چیت فرمائی ہے۔

2- احتیاط کا تقاضا ہی ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے۔

3- ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو۔ کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

4- پاکی کی حالت میں سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے۔

5- پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے، ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اسی طرح سوئے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں۔

6- ایک پاؤں کو اُٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے، کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہہ بند باندھتے تھے، اس لیے اس میں کشف عورت کا احتمال ہے البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ

ﷺ اس طریقے سے لیٹے تھے۔

7- سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے، کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے، چراغ کو بجھا دینا چاہیے کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لے جاتے ہیں، جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے، یہی حال آگ کا بھی ہے، ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگ تمہاری دشمن ہے، جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو۔

8- سوتے اور سو کر اُٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے۔

اَللّٰھُمَّ بِاسْمِکَ اَحْیٰی وَ اَمُوْتُ.

(اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں۔)

اور جاگے تو کہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَا تَنَا وَ اِلَیْہِ النُّشُوْرُ.

(اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا۔ اور جس کی طرف اُٹھ کر جانا ہے۔)

حدیثوں میں اس موقع کے لیے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

☆☆☆☆☆

آدابِ لباس

لباس سے اصل مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی۔

جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے، اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں۔ اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جز ٹھہرایا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لیے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں سے گٹوں تک اور لونڈیوں کے لیے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے، جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تنہائی میں ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں، ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیے، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو، کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو، اور ان کا لحاظ رکھو۔

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:

1- مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے، کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ ان عیش و تنعم کی

زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے، ضرورت اور مجبوری کی تشریح ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں۔ یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگا لے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

-2 مردوں کے لیے عورت کی سی پوشاک، اور عورتوں کے لیے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں، کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور وطریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور طریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

-3 عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ زمین پر گھسیٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر وغرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا۔ اسی لیے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچے نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپ ﷺ نے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہیں۔ فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں فرماتا، البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

-4 ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں پہننا ٹھیک نہیں، خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں، یا مولویوں کا نمائشی عبا، جبہ یا صوفیوں

کی گیروا رنگ، کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشاء اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے، اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

5- مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ "کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔"

6- ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو، یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہن کر حضور ﷺ کے سامنے آئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا، اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہیں۔

7- مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں۔ سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپ ﷺ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں آپ ﷺ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے، البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں، اور خوشبو کے لیے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا مردوں کے لیے منع ہے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپ ﷺ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ ﷺ نے باندھا ہے سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرمایا ہے۔

8- مردوں کے لیے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپ ﷺ نے پسند فرمائے ہیں۔

9- آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے دائیں ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیے۔

10- نیا لباس پہنتے وقت آپ ﷺ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی اس

نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے، یہ دعا پڑھتے تھے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ هٰذَا وَ رَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَ قُوَّةٍ.

اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا، اور روزی کیا میری قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)

☆☆☆☆☆

آدابِ مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے، انکی کوئی انتہا نہیں، مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہارِ مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں لیکن یہ مسرت جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے۔ قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ. (القصص76)

(جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت، اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔)

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لیے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل و کرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجا لانا چاہیے تا کہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیاز مندی کا اظہار ہو، رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدۂ شکر بجا لاتے۔

☆☆☆☆☆

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توام ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے۔ عربوں میں فخر و غرور اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہو گئی تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لیے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

آنحضرت ﷺ نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا اور گالوں پر طمانچے مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے وہ میری امت میں سے نہیں" یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت ﷺ کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ ﷺ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، پھر جب نہ مانیں تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ "ان کے منہ میں خاک بھر دو۔"

☆☆☆☆☆

سیرت النبی ﷺ

جلد ہفتم (7)

(معاملات)

اسلام کی دعوت کا مقصود

اسلام جس دن سے مذہب بنا، اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے۔ اس کی مسجد اس کا دیوان اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہوگیا تو آپ ﷺ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے نا آشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ ﷺ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا[1]، کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ ﷺ کی انسانی پادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ۔ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ وہی آسمان پر حکمران ہے۔ اور وہی زمین پر فرماں روا ہے:۔

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں

[1] سیرۃ ابن ہشام، وفد رؤسائے قریش کی گفتگو۔

اور ایوانوں سے نکالنے کے لیے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا، اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ۔ جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیے تلوار اُٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغازِ وحی کے زمانہ کی سورہ ہے، مسلمانوں کو ہشیار کیا گیا ہے۔

(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔ (مزمل 20)

یہ جنگ کی پیشینگوئی اس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ و سنان کی زبان سے بھی منانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے، اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سر و سامانی کے ساتھ ہوا اس سے کس کو اس وقت خیال ہوسکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ مدائن تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدانِ جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔

لیکن ان خوشخبریوں، بشارتوں اور پیشینگوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ

چاہیے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لیے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے مواقع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانونِ عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت، شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش و عشرت، یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال، سوءِ مآل کا موجب ہو جائے گا، اسی لیے ضروری ہے کہ کر و فر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت و حشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لیے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لیے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیے فوز و فلاح کا موجب ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے، ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں۔

مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں، اور دنیا میں امورِ خیر کی تعمیل اور امورِ شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جدوجہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

☆☆☆☆☆

عہدِ نبوی ﷺ میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظامِ حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئی وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظامِ حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی، چنانچہ 8 ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سر پر غرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہِ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو 9ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی وتمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی وتمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو، بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت وفرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے۔ لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام

فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ﷺ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے مگر آپ ﷺ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہوا جو حضور ﷺ کے سامنے بھی اور آپ ﷺ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:۔

اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا ہے۔ (البقرہ 143)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لیے اور یہ امت مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیامِ سلطنت اور آئین سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکروفریب، وغل و سازش، ظلم و ستم اور جور و تعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کا قول ہے کہ

عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔

خود حضور (ﷺ) نے فرمایا:

"عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔"

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا۔ گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

☆☆☆☆☆

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو، اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو مقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین وضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم وقوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکامِ الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے، یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خدا کے لیے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسب حکم الٰہی کیا جائے وہ دین ہے، امام

کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کا انصاف، عمال کا عمل، سپاہی کا قتل، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسب احکام الٰہی اللہ کے لیے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجب قربت ہے۔ سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یاد الٰہی میں مصروف رہیں جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و واجبات و موکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں۔

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں:

> ”امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بے شک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے، مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں، ان کی بھی، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔“
>
> (النساء 58-59)

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہہ کر ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

وَ اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ. (الرحمٰن 9)

(اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو، اور میزان میں کمی نہ کرو۔)

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لیے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تولو۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلافِ انصاف کرنیوالا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں۔

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا بھی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزاء و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں یا قوانین الٰہی ہیں، یہ احکامِ الٰہی اور قوانین الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جز ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل علم اور اہل اتقاء کو کنارہ کش رہنا چاہیے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شوروغل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار۔)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور اجراء کے لیے ہے، اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اُخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضرات خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کرام کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصودِ اصلی احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدانِ جہاد کے صبر و ثبات پر صادق اور متقی ہونے کی بشارت ہے۔

اسلام کا نظریۂ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی اور روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں۔

☆☆☆☆☆

اُمت مسلمہ کی بعثت

امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے۔ وہ نبی کے دعوی کی شاہد، حمایتی، مددگار اور گواہ ہے۔ وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگرانِ کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا۔ پیغام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظامِ عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوٰۃ و السّلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا اور امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران 110)

(قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔)

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو

جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لیے سر فروشی کرے، اور اسی لیے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں۔ (آل عمران: 104)

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا، مگر انشاء اللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی۔

اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو خدا کے پورے فرمانبردار ہوں گے اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔) (التوبہ 39)

پھر فرمایا:

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے، اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں۔ خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ (المائدہ 54)

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہو گی اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہار حق میں کسی

ملامت کی پرواہ نہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے۔

مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو، اور نیک کام کرو تاکہ فلاح پاؤ اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمہارے لیے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا، اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔ (الحج 78)

ان آیتوں سے اس شاہد امم اور مجتبائے عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں:

(1) ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی۔

(2) ادائے زکوٰۃ پر عامل۔

(3) ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط۔

(4) رکوع وسجود وعباداتِ الٰہی کی خوگر۔

(5) امور خیر پر حریص۔

(6) راہِ حق میں جہاد اور فدا کاری پر آمادہ رہنے والی۔

امت محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقاء اور قیام اور غلبہ وشوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

☆☆☆☆☆

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہِ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمان نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفید کے لیے اس کو منتخب کیا ہے۔ تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی بھی کہا جا سکتا ہے، اور اس بناء پر کہ اسلام کی حکومت میں اربابِ شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افرادِ امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لیے ضروری ہے اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریاتِ حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آ سکتا۔

☆☆☆☆☆

اسلامی روایات کی دوسری بنیاد اصل
حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف 67)
(حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔)

آیت بالا میں ارشادِ خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لیے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

لیکن احکام الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے۔

دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنہوں نے نمرود و فرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہہ ان سلاطین عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی۔ احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک و شبہہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی۔ زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں۔

امرِ تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان، اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کر سکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے، اور نہ ان کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپؑ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا، فرمایا:

> تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہو گیا۔ (البقرہ 258)

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش ہوتے ہیں:

> اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ.
>
> (آل عمران 26)
>
> (اے اللہ، سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے۔)

قانون و شرع کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے انسان آکر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کر لے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کر لے تو اس کا نام "افتراء علی اللہ" خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا۔

> "اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال و حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لیے درد ناک عذاب ہے۔" (النحل 116)

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اللہ نے حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیش گوئی فرما دی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ ﷺ جو شریعت الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکام الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے، اور اس حیثیت سے آپ ﷺ کا ہر حکم حکم الٰہی ہے لیکن حکم الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتاب الٰہی آیا:

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (التحریم 1)

(اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے مگر جب آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرما دیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو امت کے لیے حکم الٰہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے، اس [illegible] کی بنا پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حق تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الٰہی کا مبلغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔

وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ . (التوبہ 29)

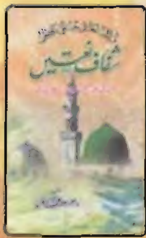
اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولو الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں

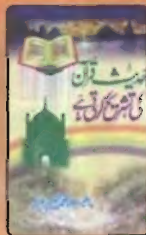
ادارے کی دیگر اہم کتب









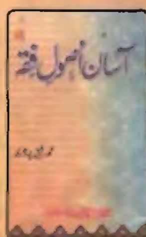
























مکتبہ قرآنیات ۰ لاہور

یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور